جلد 7 شمارہ 6 اگست 2005ء جمادی الثانی 1426ھ

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی ○ وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی ○ (الاعلیٰ 14-15)

بے شک وہ مراد کو پہنچ گیا جو پاک ہوا۔ اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا۔



عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح وفلاح کا علمبردار

ماہنامہ فلاحِ آدمیت گوجرانوالہ

Registerd

CPL No. 491

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

بیادگار خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ
بانی سلسلہ



نگران و سرپرست
محمد صدیق ڈار توحیدی صاحب
شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ

جلد 7 شمارہ 6 اگست 2005ء جمادی الثانی 1426ھ

ایڈیٹر وحید احمد

مجلس ادارت

محمد مرتضیٰ توحیدی، ایم محمد اکرم، پروفیسر منیر احمد لودھی، ایم محمد طالب
ڈاکٹر عبدالرشید وقار، محمد صدیق، سید عاشق حسنین مرتضیٰ شاہ بخاری
مولانا حافظ بشیر احمد

قیمت ———— -/20 روپے
سالانہ فنڈ ———— -/200 روپے

شیخ سلسلہ سے رابطہ کیلئے:
محمد صدیق ڈار توحیدی
مرکز تعمیر ملت نز د وحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ
Ph:0431-862835
Mob: 0320-5793520

ایڈیٹر سے رابطہ کے لئے:
وحید احمد
تھانہ روڈ بلدیہ مارکیٹ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ
Ph:0431-881379

پبلشر عامر رشید انصاری نے معراجدین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

Fax: No. +92-431-222020
E-mail: tohidia@hotmail.com

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

اس شمارے میں

مضمون	مصنف	صفحہ نمبر
اداریہ	وحید احمد	1
فکر آخرت	سید حمید اللہ شاہ بخاری	3
صفائی نصف ایمان ہے	علی رضا [illegible] ابن طاہر)	7
مسجد اقصیٰ کے خلاف اسرائیلی سازشیں	ارشاد احمد ارشد	9
وحی اور اسکی حقیقت	مولانا محمد تقی عثمانی	16
صوفیاء کا انداز فکر	صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی	26
اطاعت رسول کی حدود	مولانا شاہ محمد جعفر پھلواری	32
باطنیت	پروفیسر یوسف سلیم چشتیؒ	38
قرآن مجید فہم وتدبر سے پڑھنے کی ضرورت	ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ	45
سلطان ٹیپو شہید جرات وشجاعت کا لازوال باب	ارشاد احمد ارشد	56



اداریہ

یاد رہے توکل کے دو مقام ہیں۔ ایک مقام تو عوام کا ہے اور ایک خواص کا۔ عوام کے لئے یہی ضروری ہے کہ اسباب و ذرائع کو کبھی بھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ اگر بیمار ہوں تو طبیب کی طرف رجوع کریں۔ بیکار ہوں تو کاروبار کی بوقلموں صورتوں پر غور کریں اور مناسب تدابیر اختیار کرنے سے گریز نہ کریں۔ یعنی آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے مطابق پہلے زانوئے اشتر بند پر عمل کریں اور اس کے بعد معاملہ اللہ کی کارسازی پر چھوڑ دیں۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے وہ ان لوگوں کی ہر طرح کی مدد کرے گا۔ ہم جب توکل کی اس نوعیت کو عوام کا توکل کہتے ہیں تو اس سے مراد اس گروہ کی توہین نہیں، بلکہ محض اس فرق کو بیان کرنا ہے جو توکل کی دو صورتوں میں پایا جاتا ہے۔ ورنہ عام کاروبارِ حیات چلانے کیلئے اور تہذیب و تمدن کے تقاضوں کو آگے بڑھانے کے نقطہ نظر سے اس مقام کا ہونا بجائے خود بہت ضروری ہے۔

توکل کی دوسری صورت خواص سے متعلق ہے۔ خواص سے مقصود ایسے بلند حوصلہ افراد ہیں جو اپنی محدود خواہشات اور آرزوؤں سے دست بردار ہو چکے ہیں اور اپنے سامنے رضائے الٰہی کے سوا اور کوئی تمنا نہیں رکھتے۔ جو اللہ کی خوشنودی کیلئے زندہ ہیں اور اسی پر خوش ہیں۔ ان کا توکل یہ ہے کہ اپنی تمام تر توانائیوں اور کوششوں کو اس آرزو کی تکمیل میں کھپا دیتے ہیں کہ کس طرح اللہ تعالیٰ سے ملنے کی سعادت نصیب ہو، کس طرح وہ راضی ہو، کس ڈھنگ سے وہ اپنائے اور کس جتن سے وہ اپنے غلاموں اور حلقہ بگوشوں میں شامل کر لے۔ یہ لوگ اپنی ضروریات کا سارا بار اس محبوب حقیقی کی عنایات بے پایاں کے کندھوں پر ڈال دیتے ہیں۔ جس کے ساتھ انہوں نے وفاء و محبت کا عہد و پیماں کر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ از راہ کرم اس توکل کے صدقے ان کی ضروریات کا کفیل اور ضامن ہے۔

ارشاد ربانی ہے۔

"کیا خدا اپنے بندوں کو کافی نہیں"۔ (زمر۔۳۶)

توحید کا جان آفرین عقیدہ دل میں استغناء، خودداری اور جملہ خطرات کے مقابلہ میں بے خوفی و بے نیازی کے جذبہ کی داغ بیل بھی ڈالتا ہے اور انسان کے باطن میں یقین کا ایسا دبستان

سجا دیتا ہے جس کی شمیم آرائیوں سے کردار اور سیرت کے گوشے مہک اُٹھتے ہیں۔ جب ایک مسلمان اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھے کہ میں جب بھی اس کے بابِ اجابت پر دستک دوں گا، وہ اس کو سنے گا اور اس کی دعاؤں کو پذیرائی بخشے گا تو ظاہر ہے کہ اس کو اطمینان حاصل ہو گا، اس میں اعتماد و حوصلہ پیدا ہوگا اور یہ اِس لائق ٹھہرے گا کہ کشاکش حیات کا دلجمعی سے مقابلہ کر سکے۔ یہی نہیں ذاتِ گرامی جب پکار پکار کر دعوت دے گی کہ مانگو اور طلب و آرزو کا دامن پھیلاؤ تو کون ایسا محروم اور بدقسمت ہوگا جو اِس کے ساتھ دوستی اور عبودیت کا رشتہ جوڑنے کی کوشش نہ کرے۔

''اور تمہارے پروردگار نے کہا ہے کہ تم مجھ سے دُعا کرو میں تمہاری (دُعا) قبول کروں گا''۔

(المومن:۶۰)

''اور (اے پیغمبر) جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو (کہہ دو کہ) میں تو (تمہارے) پاس ہوں، جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے۔(البقرہ:۱۸۶)

اللہ تعالیٰ کی یکتائی اور تقاضائے توحید کے جہاں یہ معنی ہیں کہ کوئی بھی اس کی صفات میں اس کا شریک اور ساجھی نہیں وہاں یہ بھی ہیں کہ بخشش و رحمت اور حدود دستگیری کے معاملہ میں بھی اس کی کوئی نظیر پائی نہیں جاتی۔ غور کیجئے بھلا اس کے سوا اور کون ہے؟ جو انسان کے گوشت پوست اور روح و جان سے بھی زیادہ قریب تر ہونے کا دعویٰ کرے۔

''اور ہم اِس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں''۔(ق:۱۶)

(والسلام، عبدالوحید)

فکرِ آخرت

(سید حمید اللہ شاہ بخاری)

ہم سب جانتے ہیں کہ بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاری نے اپنی تصانیف میں مریدین کے لئے کثرتِ ذکر اور تزکیہ اخلاق کی اہمیت کو بڑے احسن طریقہ سے بیان فرمایا ہے اور اِسی تعلیم کو آگے پھیلانے کی تلقین کی ہے۔ ہر بھائی جو سلسلہ میں بیعت ہو کر اللہ تعالیٰ کے قرب کا خواہاں ہو اِس کیلئے لازم قرار دیا گیا ہے کہ وہ پنجوقتہ نماز اور درود شریف پڑھنے کے ساتھ ساتھ ذکر نفی اثبات اور پاس انفاس کی پابندی کرے اور اپنا اخلاق حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مطابق بنانے کی مسلسل کوشش میں لگا رہے اور یہ عظیم کام اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت واتباع کرنے ہی سے پورا ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے:۔

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون٥

"میں نے جن اور انسان اِسی لئے پیدا کئے کہ وہ میری بندگی کریں"۔

اِس سے معلوم ہوا کہ ہم انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی بندگی لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بندگی کی راہ کا نام ہی صراطِ مستقیم ہے۔ اس راہ پر چلتے رہنے ہی سے دنیا و آخرت میں سرخرو ہو سکتے ہیں ورنہ زندگی کا انجام ذلت و رسوائی کے سوا کچھ اور نہ ہوگا۔

زندگی آمد برائے بندگی　　زندگی بے بندگی شرمندگی

وہ بندگی جو حاصل حیات ہے اور بندے کو اپنے خالق و مالک کی نظروں میں محبوب بنا دیتی ہے اس کا بہترین نمونہ، اِسکی مکمل تصویر اور قرآن کریم کی تعلیم کی عملی تفسیر حضور سید الانبیاء احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کی حیات طیبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسانوں کی بزرگی اور کمال کا یہی ایک معیار ہے کہ انہوں نے کہاں تک اسوہ حسنہ کو اپنایا۔ تمام عبادات اور ذکر و اذکار کی غرض و غایت بھی یہ ہے کہ ایمان دلوں کے اندر داخل ہو جائے اور باطن پاک ہو جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے

نزدیک سب سے زیادہ عزت والا انسان وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ اس مقام کے حصول کا ایک ہی طریقہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی مکمل اطاعت کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے خود یہ حکم دیا ہے۔

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ ۝

''جس نے رسول کا حکم مانا بے شک اس نے اللہ کا حکم مانا''۔

اس آیت مبارکہ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ حضورؐ کی اطاعت اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے۔ بندگی اور عبادت تو اللہ تعالیٰ کی ہوگی لیکن حضورؐ کے طریقہ پر ہوگی اور آپؐ کے فرمودات کے مطابق ہوگی۔ جسطرح اللہ تعالیٰ کی بندگی لازم ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی اطاعت وفرمانبرداری بھی ضروری ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی بندگی سے منہ موڑنے والا گمراہ گنہگار ہوگا اسی طرح حضور علیہ السلام کی نافرمانی کرنے والا بھی گھاٹے میں رہے گا۔ اس آیت میں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دے کر پورے دین کو آپ کی اطاعت پر موقوف کر دیا۔ اسی حقیقت کو حضور علیہ السلام کے ارشادات میں ملاحظہ فرمائیں۔

☆ **علیکم بِسنتی** ۔ میری سنت پر عمل کرنا لازم کرلو (مشکوٰۃ شریف)

☆ **من راغب عن سنتٗ فلیس منی** (مشکوٰۃ شریف)

''جس نے میری سنت سے روگردانی کی اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں''۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوا کہ لوگوں سے کہہ دیجئے۔

فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ

''تم میرے فرمانبردار بن جاؤ، اللہ تم سے محبت کرے گا''۔

راہ فقر اور سلوک کا ماحصل اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کا قرب ہے۔ اس آیت میں یہ واضح کر

گیا ہے کہ جس کسی کو اللہ تعالیٰ کا محبوب بننے کی طلب ہو وہ میرے حبیب ﷺ کی اتباع میں آ جائے۔ اس کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ اور طریقہ نہیں ہے اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے ہر دور میں اسی راہ پر چلنے کی تعلیم دیتے رہے اور دے رہے ہیں۔ ہمارے ہادی و مرشد حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کی دی ہوئی تعلیم بھی قرآن وسنت کے عین مطابق ہے جو مختصر ہونے کے باوجود سریع الاثر ہے۔ سلسلہ توحیدیہ کے موجودہ شیخ جناب محمد صدیق ڈار صاحب بانی سلسلہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اسی تعلیم کے ذریعے طالبانِ راہ خدا کی خدمت اور رہنمائی فرما رہے ہیں۔ ہم توحیدی بھائیوں کا فرض ہے کہ اِس زندگی بخش تعلیم پر پورے خلوص اور دِلجمعی کے ساتھ عمل کر کے اپنی دُنیا اور آخرت سنوار لیں۔ ہمیں اپنا محاسبہ خود کرتے رہنا چاہیے تاکہ ہم طریقت توحیدیہ کے معیار پر پورا اُتر سکیں۔ کچھ بھائی نماز، تلاوت قرآن اور ذکر میں سستی کرتے ہیں جس کے نتیجے میں شیطان ان پر آسانی کے ساتھ غلبہ پالیتا ہے اور پھر وہ ہفتہ وار مجالس ذکر کی برکات سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے آپ کو سلسلہ کی تعلیم کے مطابق ڈھالیں۔ دُنیا کے سارے کام بھی ضرور کریں بلکہ احسن طریقہ سے کریں لیکن اللہ تعالیٰ کی محبت اور فکر آخرت کو دنیاوی کاموں پر غالب رہنا چاہیے۔

کچھ بھائیوں کے دل میں دنیوی متاعِ غرور کی ہوس جگہ بنالیتی ہے اور وہ اپنے شیخ سے مال و دولت، کیمیا گری اور جاہ و منصب کے لئے دُعا کے طالب رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو دولت فقر سے کوئی حصہ نہیں ملتا۔ قبلہ حضرت بانی سلسلہؒ کا قول ہے کہ ''دنیا کی فکر کو کبھی غالب نہ آنے دو، فکر اور فقر کا آپس میں بیر ہے فکر کرو گے تو فقیری نہیں ملے گی''۔

ہم توحیدی بھائیوں نے تو اپنے مُرشد کو گواہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے عہد کیا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کو مقدم رکھیں گے اور قرآن وسنت کے مطابق پاک وصاف زندگی بسر کریں گے اور بیعت عہد کی تمام شرائط کی پابندی کریں گے۔ بانی سلسلہ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ہمیں چاہیے کہ

بیعت نامہ روزانہ پڑھا کریں تا کہ زندگی کا منشور ذہنوں میں تازہ رہے۔ اسی طرح طریقت توحیدیہ میں لکھی گئی باتیں سب بھائیوں کو زبانی یاد ہونی چاہئیں تا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد کا احساس رہے اور ہم سلسلہ کی تعلیم پر عمل پیرا ہو کر دُنیا اور آخرت میں سرخرو ہو جائیں۔

☆ میری سب بھائیوں سے التجاء ہے کہ اپنے شیخ سے عقیدت، محبت اور جاں نثاری کا تعلق استوار رکھیں۔ اسکی روحانیت سے مستفیض ہو کر اپنے دلوں کو روشن اور آباد کریں۔ اپنی مشکلات میں شیخ سے دُعا کیلئے بھی درخواست کر سکتے ہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ عزت، دولت اور جاہ منصب سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ وہی دیتا ہے اور اپنے بندے کو اس کی حیثیت اور اپنی حکمت کے مطابق نوازتا ہے۔ ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ انسانوں کے ساتھ سب سے زیادہ محبت اللہ تعالیٰ کرتا ہے اور مخلوق میں سے سب سے زیادہ محبت کرنے والے حضور رحمۃ اللعالمین ﷺ ہیں۔ بزرگوں میں سے جو جتنا اللہ تعالیٰ کے قریب ہوتا ہے اس نسبت سے وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں سے پیار کرتا ہے۔ یہ یقین رکھیں کہ شیخ سلسلہ اپنے سارے مریدین، طالبین اور متعلقین سے دلی محبت کرتے اور سب کی دُنیوی اور روحانی ترقی کے لئے دُعائیں کرتے رہتے ہیں۔

☆ آخر میں ایک التجاء خادمان حلقہ سے ہے کہ طالب بھائیوں کو بیعت کرانے میں جلدی نہ کیا کریں۔ صرف اُن بھائیوں کو بیعت کرایا جائے جو تعلیم پر پختگی کے ساتھ عمل پیرا ہو جائیں انکا اخلاق توحیدیہ معیار کے مطابق ہو جائے اور وہ اپنی منزل کی جانب ذوق وشوق کے ساتھ رواں دواں ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نمازوں، ذکر اور قرآن کریم کی مزید محبت عطا فرمائے۔ آمین!

صفائی نصف ایمان ہے

(امین طاہر)

روز آخرت پر یقین رکھنے والا ہر انسان زیادہ سے زیادہ نیکی کی طرف راغب ہوتا ہے اور گناہوں سے ہر ممکن طریقے سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ آخر اسے اپنے رب کریم کے حضور پیش ہونا ہے اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے، کامیابی کا دارومدار اس کے اعمال صالحہ پر ہے اور ان اعمال صالحہ کا اجر اسے جنت کی شکل میں ملتا ہے۔ اگر وہ گناہ کی زندگی گزارتا رہا تو آخر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا اور بدلے میں دوزخ میں داخل کر دیا جائے گا۔ جو لوگ اللہ کی محبت کے طالب ہیں اور اسکی دید کو ترستے ہیں وہ تو گناہ کے خیال کو بھی مضر جانتے ہیں اور ان کے نزدیک تو گناہ کا خیال بھی گناہ کرنے کے مترادف ہے۔ بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ فرماتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ کے دیدار کے حصول کیلئے پہلا زینہ یہ ہے کہ سالک کے دل میں گناہ کا خیال ہی نہ آئے۔ سلسلہ توحیدیہ کے سب بھائی تو اللہ کی محبت، قرب اور دیدار کے طالب ہوتے ہیں اس لئے ان کو دوسرے لوگوں کی نسبت بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ اور سب کو اس کوشش میں لگے رہنا چاہیے کہ گناہ کرنا تو ایک طرف اس کا خیال بھی دماغ میں نہ آنے پائے۔

یہ چیز ایک دو روز میں تو حاصل نہیں ہو جاتی بلکہ اس کیلئے تو سب بھائیوں کو سالہا سال محنت کرنا پڑے گی اور برابر کوشش کرنے سے یہ بات پیدا ہوگی۔ آپ لوگوں کو اس کیلئے تمام ذرائع استعمال کرنا ہونگے، تزکیہ اخلاق کرنا ہوگا، مجاہدہ کرنا ہوگا اور سب سے بڑھ کر ہمیشہ صاف ستھرا رہنا ہوگا۔ یہ آخری بات صاف ستھرا رہنے والی شاید آپ لوگوں کو زیادہ متاثر نہ کرے لیکن اس میں ایک نازک رمز پوشیدہ ہے کہ اس ہدایت پر عمل کرنے والا گناہوں سے بچ جاتا ہے۔ میں اب اس کی تھوڑی سی وضاحت پیش کرتا ہوں۔ میں کئی برس اس بات پر غور و فکر کرتا رہا کہ کس حالت میں انسان سے زیادہ گناہ سرزد ہوتے ہیں اور کس حالت میں وہ عموماً ان سے محفوظ رہتا ہے۔ اس غور و فکر میں بھی اپنی ذات کا اور دوسرے لوگوں کی زندگیوں کا تجزیہ کرتا رہا۔ آخرکار اللہ تعالیٰ نے یہ معاملہ مجھ پر کھول دیا۔

بات یہ ہے کہ جب انسان صاف ستھرا رہتا ہے تو وہ کم گناہ کرتا ہے اور جب وہ پاکیزگی کی حالت میں نہیں ہوتا تو زیادہ گناہ کرتا ہے۔

ہماری فضاء میں رحمانی اور شیطانی قوتیں پھیلی ہوئی ہیں۔ جو انسان ہمیشہ صاف ستھرا رہتا ہے اس پر رحمانی قوتیں اپنا اثر ڈالتی ہیں، جبکہ گندے اور ناپاک انسان پر شیطانی قوتیں اپنا اثر ڈالتی ہیں اور اسے گناہ پر آمادہ کرتی ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح سے ہے جیسا کہ گندی مکھی ہمیشہ صاف جگہ چھوڑ کر گندگی پر ہی بیٹھتی ہے جبکہ کہ شہد کی مکھی پھولوں پر بیٹھتی ہے، اب راہ سلوک کا مسافر ہمیشہ صاف ستھرا رہتا ہے اور اس کوشش میں رہتا ہے کہ ہمیشہ وضو میں رہے۔ تو اس پر رحمانی قوتیں اپنا اثر ڈالتی ہیں اور اسکے نتیجے میں وہ گناہ سے احتراز کرتا اور نیکی پر آمادہ ہوتا ہے اس کے برعکس جو سالک صفائی کا خیال نہیں رکھتا اس پر شیطانی قوتیں اپنا اثر ڈالتی ہیں اور وہ گناہ پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ اسی لئے حضور نبی کریم ﷺ نے پیاز، لہسن (اور اس طرح کی دوسری چیزیں جن کے کھانے کے بعد منہ سے بدبو آئے) کھا کر مسجد آنے سے منع فرمایا ہے اور آپ نے صفائی کو نصف ایمان کا درجہ دیا ہے اور صفائی کے متعلق ایک اور حدیث مبارکہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ "صفائی ایمان کی شرط ہے"۔

ان احادیث مبارکہ کی روشنی میں ہمیں اپنے نصف ایمان کو قائم کرنا ہے تا کہ ہم لوگ گناہوں سے بچ سکیں، یہاں تک کہ گناہ کا خیال بھی ہمارے دل میں نہ آئے اور ہمارے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی دید کا پہلا درجہ پیدا ہو جائے۔ مسلسل محنت اور درحقیقت اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے طفیل ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں۔

صوفیائے کرام نے ہر وقت باوضو رہنے کی بڑی برکات بیان کی ہیں کیونکہ یہ بھی ایک قسم کی عبادت ہے۔ ہر وقت باوضو رہنے والا انسان فرشتوں کی مشابہت اختیار کرتا ہے جو ہمہ وقت طہارت کی حالت میں رہتے ہیں۔ کئی بزرگوں نے سونے سے قبل وضو کرنے کے بہت سے فوائد گنوائے ہیں اور باہمت لوگ اس پر عمل بھی کرتے ہیں اور باطہارت نیند میں داخل ہوتے ہیں۔ شریعت کے احکام میں یہ بھی داخل ہے کہ اگر کسی وجہ سے غسل واجب ہو جائے اور سونے سے پہلے غسل نہ کر سکو تو متعلقہ اعضاء کو دھو کر وضو کر کے سونا چاہیے۔ ظاہری اور جسمانی طہارت کا اثر روح پر بھی پڑتا ہے۔ انسان کے لباس پر گندگی کی چھینٹیں پڑی ہوں یا اسے استنجا کی حاجت وغیرہ لگائے تو اس کی طبیعت بوجھل ہو جاتی ہے اس کے برعکس انسان نہا دھو کر اُجلا لباس پہنے تو روح فرحت اور کشادگی محسوس کرتی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ صفیں سیدھی رکھا کرو اللہ تعالیٰ تمہارے دل سیدھے کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس پاکیزہ تعلیم کے مطابق ظاہری اور باطنی طہارت کی توفیق سے نوازے اور اپنے مقربین میں شامل فرمائے۔ آمین!

مسجد اقصیٰ کے خلاف اسرائیلی سازشیں

(ارشاد احمد ارشد)

بچے کیلئے چھلانگ لگانا ممکن نہ تھا، اس لئے کہ بلندی زیادہ تھی۔ مگر باپ بار بار بیٹے کو حوصلے دے رہا تھا کہ چھلانگ لگا دو! میں زمین پر گرنے سے پہلے تمہیں تھام لوں گا۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں ہرگز چوٹ نہیں لگے گی۔ مگر بیٹا ہچکچا اور ڈر رہا تھا جبکہ باپ بار بار اس کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ آخر بچے نے باپ کے اصرار کو دیکھتے اور شفقت پدری پر اعتماد کرتے ہوئے چھلانگ لگا دی۔ وہ جیسے ہی نیچے کو دا باپ اپنے لختِ جگر کو تھامنے کی بجائے ایک طرف ہو گیا اور بچہ سیدھا زمین پر آ گرا۔ لگنے والی چوٹوں اور تکلیف کی شدت سے وہ کراہنے اور سسکنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو، فریاد اور شکایت تھی جبکہ چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ باپ اس کی تکلیف کی پروا نہ کرتے ہوئے یوں گویا ہوا۔

اے جان پدر!

تم یہودی باپ کے بیٹے اور قوم یہود کے فرزند ہو، اس واقعہ میں تمہارے لیے پہلا سبق یہ ہے کہ کبھی کسی پر یقین نہ کرو! چاہے وہ سگا باپ ہی کیوں نہ ہو، کیا تم نے دیکھا نہیں کہ میں نے باپ ہو کر تمہیں کیسے دھوکہ دیا ہے! سو تمہیں بھی چاہئے کہ اپنا کام نکالنے کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ دھوکہ دہی اور فریب سے کام لینا سیکھو۔ تمہیں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ پوری یہودی قوم کی کامیابی کا راز دھوکہ دہی اور فریب کاری میں ہے"۔ یہ واقعہ اور اس میں یہودی باپ کی نصیحت پوری یہودی قوم کی فطرت و ذہن کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔

تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ یہودی نے اسی قسم کی عیاریوں اور مکاریوں سے کام لیتے ہوئے اولاً عثمانی دور خلافت میں مملکت ترکیہ میں قدم جمائے' ثانیاً ارض فلسطین پر پنجے گاڑے' اس کے بعد بیت المقدس پر قبضہ کر کے ارض فلسطین کے مالک بن بیٹھے۔ یہودی مملکت عثمانیہ میں جب تک محکوم تھے' انتہائی معصوم اور مظلوم بن کر رہے جب انہیں پاؤں پھیلانے اور پنجے مضبوط کرنے کا موقع ملا تو وہ اپنے اصل رنگ میں سامنے آتے چلے گئے۔ یہ بات تاریخی شواہد سے ثابت ہے کہ یہودی ارض فلسطین کے اصلی نسلی اور موروثی باشندے کبھی بھی نہیں

رہے۔ بلکہ یہ غاصب کی حیثیت سے وارد ہوئے تھے۔ تاریخ میں یہ بات صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ بنی اسرائیل تیرہ سو برس قبل مسیح اس علاقے میں داخل ہوئے۔ یہاں کے مالک اور قدیم باشندے دوسرے لوگ تھے جن کے قبائل اور اقوام کے نام تک بائبل میں موجود ہیں۔ یہودیوں نے ان اقوام کا قتل عام کر کے ارض فلسطین پر اسی طرح قبضہ کر لیا جس طرح باہر سے آنی والی قوم نے ریڈ انڈین کو تباہ کر کے امریکہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہودیوں کا یہ قبضہ عارضی نوعیت کا تھا بعد کے حالات سے آٹھویں صدی قبل مسیح میں معلوم ہوتا ہے کہ اثیریا نے شمالی فلسطین پر قبضہ کر کے اس واقعہ کے بعد یہودیوں نے ایک مرتبہ پھر اس خطہ سے اسرائیلیوں کا بالکل خاتمہ کر دیا۔ ارض فلسطین کو اپنا مسکن بنایا تو پھر چھٹی صدی قبل مسیح میں بابل کا بادشاہ بخت نصر عذاب الٰہی بن کر ان پر ٹوٹ پڑا اس نے جنوبی فلسطین پر قبضہ کر کے سارے یہودیوں کو جلا وطن کر دیا اور بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ طویل عرصہ تک جلا وطنی کے بعد شاہان ایران کے دور میں یہودیوں کو پھر سے فلسطین میں آباد ہونے کا موقعہ ملا۔ پھر دوسرا وقفہ بھی تین چار سو برس سے زیادہ طویل نہیں ہے۔ 70 عیسوی میں یہودیوں نے رومی بادشاہ کے خلاف بغاوت کی جس کی پاداش میں بیت المقدس کو ایک دفعہ پھر مسمار کر دیا گیا۔ اس کے بعد 135 عیسوی میں رومیوں نے پورے فلسطین سے یہودیوں کو نکال دیا۔ الغرض جب اسلام کا سورج خطہ عرب میں طلوع ہوا تو اس وقت ارض فلسطین میں عرب اقوام آباد تھیں۔ جبکہ یہودی خال خال تھے۔

امیر المومنین عمر فاروقؓ فتح فلسطین کے موقعہ پر 15 ہجری 636ء میں بیت المقدس میں تشریف لائے تو اس وقت حدود شہر بیت المقدس میں 12 ہزار یونانی اور 50 ہزار اصل عرب باشندوں کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے۔ امیر المومنین نے حکم دیا کہ تمام یونانی تین دن کے اندر شہر سے نکل جائیں۔ جبکہ شہر کے اصل باشندے خراج ادا کریں۔ فتح بیت المقدس تاریخ کا ایک واقعہ تھا، تاریخ نے اس واقعہ کی تمام تفصیلات کو اپنے اندر محفوظ کر لیا ہے۔ ان تفصیلات میں یونانی اور عرب باشندوں کا ذکر تو ہے مگر یہودیوں کا ذکر نہیں ہے۔ اس کا بدیہی مطلب یہ ہے کہ فتح بیت المقدس کے وقت اس خطہ میں یہودی نہیں تھے، یہ وہ وقت تھا کہ جب عیسائیوں کے نزدیک یہودی اچھوت تھے، ان کا داخلہ بیت المقدس میں قانوناً ممنوع تھا۔

اس بات کی تصدیق فتح بیت المقدس کے وقت عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہونے والے معاہدہ سے ہوتی ہے۔ اس معاہدہ میں عیسائیوں نے ایک شق یہ رکھی تھی کہ "یہودی ہمارے ساتھ بیت المقدس میں نہیں رہ سکیں گے"۔ عیسائیوں نے اگر بیت المقدس کے دروازے یہودیوں پر بند کئے تو اِن کی عیاریوں اور مکاریوں کی وجہ سے کئے تھے۔

ماضی میں یہودی فلسطین پر جتنا عرصہ قابض رہے ہیں، اس قبضہ کی تاریخ چار سے آٹھ سو سال کے عرصہ پر محیط ہے۔ یہ قبضہ بھی ابتدا میں دھوکہ دہی پھر اصل موروثی باشندوں کے قتل عام کے نتیجہ میں مستحکم ہوا، اِس کے برعکس عرب فلسطین میں ڈھائی ہزار سال آباد چلے آرہے ہیں۔

جہاں تک یہودیوں کے اِس دعویٰ کا تعلق ہے کہ بیت المقدس میں ان کا ہیکل سلیمانی تھا اور مسلمانوں نے ہیکل کو مسمار کر کے اِس جگہ مسجد اقصیٰ کو تعمیر کیا ہے۔ اس دعویٰ کی حقیقت یہ ہے کہ 70 عیسوی میں رومیوں نے ہیکل کو بالکل مسمار کر دیا تھا۔ حضرت عمرؓ کے دور میں جب بیت المقدس فتح ہوا تو یہاں ایک بھی یہودی نہ تھا۔ لہٰذا یہودیوں کی عدم موجودگی میں ان کے کسی معبد کا بیت المقدس میں ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اِس لئے یہودیوں کا یہ دعویٰ من گھڑت اور الزام بے بنیاد ہے کہ ان کے کسی معبد کو توڑ کر مسلمانوں نے یہ مساجد بنائی تھیں۔

اسلام سے قبل عیسائیوں کے دور حکومت میں یہودی اچھوت کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہر یہ مسلمانوں کی شرافت تھی کہ انہوں نے یہودیوں پر عیسائیوں کی طرف سے عائد کی گئی پابندیوں اور سختیوں کو نرم کیا۔ یہودی علماء اور مورخ اِس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی تاریخ کا شاندار اور سب سے سنہری دور وہ دور تھا جب اندلس میں مسلمانوں کی رعایا کی حیثیت سے رہتے تھے۔ اندلس پر جب عیسائیوں نے قبضہ کیا تو انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ یہودیوں کو بھی باہر نکال کیا۔ تب بھی اگر یہودیوں کے لئے کسی ملک نے اپنی آغوشِ محبت کو وا کیا تو وہ خلافت عثمانیہ تھی۔

مسلمانوں کے یہودیوں پر کس قدر احسانات ہیں اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بمبئی سے شائع ہونے والے اسرائیلی حکومت کے سرکاری بلٹن نے اپنی ایک اشاعت میں لکھا کہ "دیوار گریہ پہلے ملبے اور کوڑے کے ڈھیر میں دبی ہوئی تھی اور اس کا کوئی نام و

صدی عیسوی میں سلطان ... واقف تھا اس کا علم ہوا اور اس نے اس جگہ کو پورے سرکاری اہتمام کے ساتھ صاف کروا کر یہودیوں کو اس کی زیارت کی نشان تک لوگوں کو معلوم نہ تھا۔ 16 ویں

اجازت دی"۔

مسلمانوں کی یہودیوں کے ساتھ محبت اور شفقت کی یہ حالت تھی عثمانی خلفاء نے انہیں دربار میں عزت و توقیر بخشی مگر یہودیوں نے سانپ اور بچھو کی سی فطرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ارض فلسطین کو قومی ریاست بنانے کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے۔

عثمانی خلفاء کی شفقت و نرمی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے **1880**ء میں یہودیوں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت فلسطین کی طرف مہاجرت کا سلسلہ شروع کیا۔ اِس کے بعد مشہور یہودی لیڈر تھیوڈور ہرتزل نے **1897**ء میں مہاجرت کو باقاعدہ تحریک کی شکل دی اور اس بات کو مقصود قرار دیا کہ فلسطین پر دوبارہ قبضہ اور ہیکل سلیمانی کو تعمیر کیا جائے۔ یہودی سرمایہ کاروں نے ہجرت کرنے والوں کو فنڈز دیئے تاکہ وہ وہاں زمینیں خریدیں اور اپنی بستیاں آباد کریں۔ **1901**ء میں ہرتزل نے سلطان عبدالحمید کو اپنی قوم کی طرف سے پیغام بھجوایا کہ وہ ترکی کے تمام قرضے ادا کرنے کے لئے تیار ہیں اگر فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی اجازت دے دی جائے۔ مگر سلطان نے اسلامی غیرت وحمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہرتزل کے پیغام کو حقارت سے ٹھکرا دیا اور کہا:۔

"جب تک میں زندہ ہوں اور ترکی خلافت قائم ہے تب تک اِس بات کا قوی امکان نہیں کہ فلسطین کو یہودیوں کے حوالے کر دیا جائے۔ سلطان نے مزید کہا

"مجھے تمہاری ساری دولت سے خطہ فلسطین کا ایک ذرہ بھی زیادہ محبوب ہے اور کہا میں تمہاری ساری دولت پر تھوکتا ہوں"۔

ہرتزل نے اپنی قوم کے جن افراد کو سلطان کے پاس پیامبر بنا کر بھیجا تھا، ان میں ایک "حاخام قرہ صوآفندی" یہودی تھا۔ یہ سالونیکا کا باشندہ تھا اور ان یہودی خاندانوں میں سے تھا جو سپین سے نکالے جانے کے بعد سلطان کی دعوت پر ترکی میں آباد ہوئے تھے۔ قرہ صوآفندی کا اس مہم میں شامل ہونا گویا احسان فراموشی کی انتہا ہے۔ سلطان کے صاف انکار کے بعد ہرتزل

طرف سے انہیں بُرے انجام کی دھمکی دی گئی۔

اس کے بعد یہودیوں نے خلافت عثمانیہ کی جڑیں کاٹنے کی سازشیں شروع کر دیں۔ یہودیوں نے اِس مقصد کی خاطر ان ترکی مسلمانوں کو اپنا آلہ کار بنایا جو مغربی تعلیم کے زیر اثر قوم پرستی کے علمبردار بن گئے تھے۔ ان لوگوں نے ترکی فوج میں اپنے اثرات پھیلائے نوبت یہاں تک پہنچی کہ سات سال کے عرصہ میں مسلمانوں نے سلطان کو معزول کر دیا۔ ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ ترکی کی آزادی کے نام نہاد مسلمان دعویداروں کی طرف سے 1908ء میں سلطان کی معزولی کیلئے جو تین آدمی پروانہ لیکر گئے اِن میں دو ترک اور تیسرا وہی حاخام قرہ صوآفندی تھا جس کے ہاتھ ہرتزل نے پیغام بھجوایا تھا کہ فلسطین کو یہودیوں کے حوالے کر دیا جائے۔

سلطان کی معزولی اگر یہودی سازشوں کی ابتداء تھی تو اس کی انتہا یہ تھی کہ ترکی کی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ اس مقصد کی خاطر عربوں اور ترکوں میں قوم پرستی کے مکروہ جذبات کو فروغ دیا گیا۔ ترکوں میں اِس مقصد کی بارآوری کیلئے مصطفیٰ کمال پاشا جیسے لوگ تھے تو عربوں میں لارنس آف عریبیہ جیسے لوگ تیار کئے گئے۔ ان سازشوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں عرب اور ترک باہم برسرِ پیکار ہو گئے۔

جنگ اول عظیم شروع ہوئی تو برطانیہ پوری طرح یہودیوں کے ہاتھ میں کھیل رہا تھا۔ انگریز عربوں کو یقین دلا رہے تھے کہ اگر وہ ترکوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں تو انہیں خودمختار ریاستوں کا مالک بنا دیا جائے گا۔ دوسری طرف ترکوں کو باور کروایا جا رہا تھا کہ ترکی ترکوں کا ہے اور عرب ترکوں پر بوجھ ہیں۔ اس بوجھ کو جتنی جلدی اُتار پھینکا جائے اتنا ہی بہتر ہو گا۔ تیسری طرف یہودیوں کو یقین دہانی کروائی جا رہی تھی کہ ارض فلسطین کا مالک انہیں بنا دیا جائے گا۔ چنانچہ یہودیوں نے 1917ء میں اعلان بالفور کے نام سے اپنی ریاست کے قیام کا پروانہ برطانوی حکومت سے حاصل کر لیا۔ لارڈ بالفور نے اِس ضمن میں اپنی ڈائری میں یہ الفاظ لکھے تھے کہ:۔

''ہمیں فلسطین کے متعلق کوئی فیصلہ کرتے ہوئے وہاں کے باشندوں سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں صیہونیت ہمارے لئے اِن سات لاکھ عربوں کی خواہشات اور تعصبات سے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جو اِس قدیم سرزمین میں آباد ہیں''۔

اعلان بالفور کے ساتھ ہی یہودیوں کے منصوبے کا پہلا مرحلہ مکمل ہو گیا۔ اس کے بعد مجلس اقوام نے انقلاب کے نام پر برطانیہ کو عربوں کا قائم مقام حکمران قرار دیتے ہوئے پوری بے شرمی کے ساتھ یہ اختیار دیا کہ:۔

”فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کے لئے ہر طرح کی آسانیاں فراہم کی جائیں اور صہیونی تنظیم کو باقاعدہ سرکاری سطح پر تسلیم کر کے اس نظم و نسق میں شریک کیا جائے“۔

یہ یہودیوں کے طویل المعیاد منصوبے کی دوسری کامیابی تھی۔ اس کے بعد سرکاری سرپرستی میں فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری کا سلسلہ شروع ہوا۔ فلسطین کا پہلا برطانوی ہائی کمشنر سر ہربرٹ سیموئل خود ایک یہودی تھا۔ فلسطین کی عارضی حکومت میں یہودیوں کو وزارتیں دے دی گئیں۔ اس کے بعد عربوں کی جائیدادیں ضبط اور یہودیوں کی وسیع پیمانے پر آبادکاری کا سلسلہ شروع ہوا۔

1947ء میں برطانی حکومت نے مسئلہ فلسطین اقوام متحدہ میں پیش کر دیا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ارض فلسطین کو یہودیوں اور عربوں کے درمیان تقسیم کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا۔ فیصلہ کی رو سے 55 فی صد رقبہ 33 فیصد والی یہودی آبادی کو اور 45 فیصد رقبہ 67 فیصد والی عرب آبادی کو دے دیا گیا۔

ان حالات میں عین اس وقت کہ جب جنرل اسمبلی میں مسئلہ فلسطین پر بحث ہو رہی تھی یہودی اتھارٹی نے 14 مئی 1948ء کو رات دس بجے یہودی ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ اقوام متحدہ نے یہودیوں کو فلسطین میں فوجی ریاست قائم کرنے کا مجاز نہ کیا تھا۔ اس کے باوجود ناجائز یہودی ریاست کو سب سے پہلے امریکہ اور روس نے تسلیم کر لیا۔

اس کے بعد یہودی ریاست کے قیام کا تیسرا مرحلہ اس وقت شروع ہوا جب 5 جون 1967ء کو اسرائیل نے مصر پر حملہ کیا۔ بعد ازاں اس جنگ میں شام اردن، عراق اور سعودی عرب بھی شامل ہو گئے۔ 80 گھنٹے تک جاری رہنے والی اس جنگ میں عربوں کو شرمناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ نومبر 48ء میں اسرائیلی ریاست کا رقبہ 993 مربع میل تھا اور جون 67ء کی جنگ میں اس کے اندر 27 ہزار مربع میل کا اضافہ ہو گیا۔ 7 جون 1967ء کا بھی دن

منحوس دن تھا کہ جب یہودیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کیا۔ یہی وہ دن تھا کہ جب بیت المقدس کی فضائیں آفاقی صدائے اذان کی آواز سے محروم ہوگئیں۔ مسجد اقصیٰ کا صحن و درودیوار خون مسلم سے سرخ ہو گئے۔ بیت المقدس کی ہر گلی ہر کوچے اور ہر گھر میں مسلمانوں کی لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ ہیکل سلیمانی کا خواب دیکھنے والے یہودی جب مسجد اقصیٰ میں داخل ہوئے تب ہزاروں مسلمان مسجد کے دروازے پر اپنی جانیں نچھاور کر چکے تھے۔ اب صرف مسجد کا موذن عزیز ہی بچا تھا جب اس نے دیکھا کہ ہزاروں مسلمان مسجد کی حرمت پر جانیں قربان کر چکے ہیں تو وہ اکیلا ہی شیر کی طرح بپھرا اور چیتے کی طرح دشمن پر ٹوٹ پڑا۔ یہودی سپاہیوں نے ایک قہقہہ لگایا اور رائفل کی سنگین اس کے سینے سے پار کردی۔ سو مسجد سے اذان بلند کرنے والی آواز ہمیشہ کیلئے خاموش ہوگئی۔

یہودیوں کو یہ کامیابی اپنی عیاریوں مکاریوں اور باہمی اتحاد سے ملی جبکہ مسلمانوں کو یہ روز سیاہ اپنی بداعمالیوں اور نااتفاقی کی وجہ سے دیکھنا پڑا۔ مسلمان حکمرانوں نے مسئلہ فلسطین سمیت اُمت کے اجتماعی مسائل میں کبھی بھی خلوص اور سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔ اس کی حالیہ اور تازہ مثال صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف کا جنرل اسمبلی سے خطاب ہے۔ انہوں نے 59 ویں اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ”ہم (یعنی اُمت مسلمہ) اسرائیل کے وجود کا حق تسلیم کرتے ہیں“۔ اس کے دوسرے روز ہی اسرائیل نے خیر سگالی کے طور پر مسجد اقصیٰ اور حرم ابراہیمی پر دھاوا بول دیا۔ آگ لگانے کی کوشش کی اور خدام کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔

وحی اور اس کی حقیقت

(مولانا محمد تقی عثمانی)

وحی اور کشف والہام اوپر بتایا جاچکا ہے کہ وحی صرف انبیا علیہم السلام کے ساتھ خاص ہے، اور کسی بھی غیر نبی کو خواہ وہ تقدس اور ولایت کے کتنے بلند مقام پر ہو، وحی نہیں آسکتی۔ البتہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنے بعض خاص بندوں کو کچھ باتیں بتا دیتا ہے، اسے کشف یا الہام کہا جاتا ہے، کشف اور الہام میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے یہ فرق بیان فرمایا ہے کہ کشف کا تعلق حسیات سے ہے، یعنی اس میں کوئی چیز نظر نہیں آتی، صرف دل میں کوئی بات ڈال دی جاتی ہے اسی لئے عموماً الہام کشف کی بہ نسبت زیادہ صحیح ہوتا ہے۔

وحی کی آخری صورت یعنی "نفث فی الروع" بظاہر الہام سے بہت قریب ہے کیونکہ دونوں کی حقیقت یہی ہے کہ دل میں کسی بات کا القاء کر دیا جاتا ہے، لیکن دونوں میں حقیقت کے اعتبار سے یہ فرق ہے کہ وحی میں ۔۔۔ جو صرف نبی کو ہوتی ہے ۔۔۔ ساتھ ساتھ یہ علم بھی ہو جاتا ہے کہ یہ بات کس نے دل میں ڈالی ہے؟ چنانچہ حاکمؒ کی مذکورہ روایت میں آنحضرت ﷺ نے صراحۃ بتلا دیا کہ "روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے"۔ لیکن الہام میں ڈالنے والی کی تعیین نہیں ہوتی، بس یہ محسوس ہوتا ہے کہ دل میں کوئی ایسی بات آ گئی ہے جو پہلے نہیں تھی، اسی بناء پر انبیاء علیہم السلام کی وحی سو فیصد یقینی ہوتی ہے اور اس کی پیروی فرض ہے، لیکن اولیاء اللہ کا الہام یقینی نہیں ہوتا، چنانچہ نہ وہ دین میں حجت ہے اور نہ اس کا اتباع فرض ہے، بلکہ اگر کشف، الہام یا خواب کے ذریعہ کوئی ایسی بات معلوم ہو جو قرآن وسنت کے معروف احکام کے مطابق نہیں ہے تو اس کے تقاضے پر عمل کرنا کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے۔

وحی متلوّ اور غیر متلوّ آنحضرت ﷺ پر جو وحی نازل ہوئی وہ دو قسم کی تھی، ایک تو قرآن کریم کی آیات، جن کے الفاظ اور معنی دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھے اور جو قرآن کریم میں ہمیشہ کیلئے اس طرح محفوظ کر دی گئیں کہ ان کا ایک نقطہ یا شوشہ بھی نہ بدلا جاسکا ہے اور نہ بدلا جا سکتا ہے۔ اس وحی کو علما کی اصطلاح میں "وحی متلوّ" کہا جاتا ہے یعنی وہ وحی جس کی تلاوت کی جاتی ہے، دوسری قسم اُس وحی کی ہے جو قرآن کریم کا جزو نہیں بنی، لیکن اس کے ذریعہ آپ کو بہت

ے احکام عطا فرمائے گئے ہیں اس وحی کو "وحی غیر متلو" کہتے ہیں، یعنی وہ وحی جس کی تلاوت نہیں کی جاتی، عموماً وحی متلو یعنی قرآن کریم میں اسلام کے اصولی عقائد اور بنیادی تعلیمات کی تشریح پر اکتفا کیا گیا ہے، ان تعلیمات کی تفصیل اور جزوی مسائل زیادہ تر وحی غیر متلو کے ذریعہ عطا فرمائے گے ہیں۔ یہ "وحی غیر متلو" صحیح احادیث کی شکل میں محفوظ ہیں اور اس میں عموماً صرف مضامین وحی کے ذریعہ آپؐ پر نازل کئے گئے ہیں، ان مضامین کو تعبیر کرنے کیلئے الفاظ کا انتخاب آپؐ نے خود فرمایا ہے۔ ایک حدیث میں سرکارِ دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے:۔

أُوتيت القرآن و مثله مَعَهٗ

"مجھے قرآن بھی دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اسی جیسی دوسری تعلیمات"

اس میں قرآن کریم کے ساتھ جن "دوسری تعلیمات" کا ذکر ہے اُن سے مراد یہی وحی غیر متلو ہے:۔

اسلامی احکام کی جزوی تفصیلات چونکہ اسی وحی غیر متلو کے ذریعہ بتائی گی ہیں، اس لئے جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہنے کے باوجود اسلامی احکام کی پابندیوں سے آزاد زندگی گذارنا چاہتے ہیں انہوں نے کچھ عرصہ سے یہ شوشہ چھوڑا ہے کہ "وحی غیر متلو" کوئی چیز نہیں، آنحضرت ﷺ پر جتنی وحی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہے وہ سب قرآن کریم میں محفوظ ہے، قرآن کریم کے علاوہ جو احکام آپؐ نے دیئے وہ ایک سربراہِ مملکت کی حیثیت سے دیئے جو صرف اُس زمانے کے مسلمانوں کے لئے واجب العمل تھے، آج اُن پر عمل کرنا ضروری نہیں۔

لیکن یہ خیال بالکل غلط اور باطل ہے، خود قرآن کریم کی متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہی کہ وحی الٰہی صرف قرآن کریم میں منحصر نہیں، بلکہ آیاتِ قرآنی کے علاوہ بھی آپ کو بہت سی باتیں بذریعہ وحی بتائی گئی تھیں، اس بات کی تائید میں چند قرآنی دلائل ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) وما جعلنا القبلة التی کنت علیها الا لنعلم من یتبع الرسول ممن ینقلب علی عقبیه (البقرہ:۱۴۳)

"اور جس قبلہ کی طرف آپؐ پہلے (رُخ کرتے) تھے، اسے ہم نے صرف اس لئے مقرر کیا تھا تاکہ یہ جان لیں کہ کون رسولؐ کی اتباع کرتا ہے اور کون اپنی ایڑیوں کے بل پلٹ جاتا ہے"۔

ہر مسلمان جانتا ہے کہ آنحضرت ﷺ مدینہ طیبہ میں ایک عرصہ تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے ہیں، اِس کے بعد جب دوبارہ بیت اللہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم صرف اِس لئے دیا تھا تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ کون اِس حکم کی تعمیل کرتا ہے اور کون انکار... یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ اس آیت میں بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کے حکم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب منسوب فرمایا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حکم بھی ہم نے ہی دیا تھا، اب قرآن کریم کو الحمد سے لے کر والناس تک پڑھ جایئے، اس میں کہیں یہ حکم نہیں ملے گا کہ "بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھو"۔ اِس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ نے کسی ایسی وحی کے ذریعہ دیا تھا جو قرآن کریم میں کہیں مذکور نہیں اور اِسی کا نام "وحی غیر متلو" ہے۔

(۲) فلما نبات به واظهره الله عليه عرف بعضهٔ واعرض عن بعض الخ (التحریم:۳)

"پس جب اُس (عورت) نے آپ کو اِس کی خبر دی اور اللہ نے اس کو آپ پر ظاہر کر دیا..."

اِس آیت کی تشریح مختصراً یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ایک زوجہ مطہرہ نے ایک بات آنحضرت ﷺ سے چھپانی چاہی تھی، اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی آپ کو وہ بات بتلا دی۔ انہوں نے آپؐ سے پوچھا کہ یہ بات آپ کو کس نے بتائی؟ آپؐ نے فرمایا مجھے یہ بات علیم و خبیر یعنی اللہ تعالیٰ نے بتلا دی تھی، اس آیت میں تصریح ہے کہ وہ پوشیدہ بات اللہ تعالیٰ نے آپ کو بذریعہ وحی بتلائی تھی، حالانکہ پورے قرآن کریم میں اِس کا کہیں ذکر نہیں ہے، اِس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ اطلاع آپ کو وحی غیر متلو کے ذریعہ دی گئی تھی۔

اور بھی متعدد آیات سے وحی غیر متلو کا ثبوت ملتا ہے، یہاں اختصار کے پیش نظر صرف اُن دو آیتوں پر اکتفا کیا جاتا ہے، اگر تحقیق حق مقصود ہو تو یہ دو آیتیں بھی اِس بات کا ناقابل انکار ثبوت مہیا کرنے کے لئے کافی ہیں کہ وحی غیر متلو بھی وحی کی ایک قسم ہے اور وہ بھی وحی متلو کی طرح واجب الاتباع ہے۔

وحی پر عقلی شبہات

یہ وحی اور اس کی حقیقت سے متعلق وہ ضروری معلومات تھیں جو...

وسنت سے ثابت ہیں، ہم شروع میں لکھ چکے ہیں کہ وحی اُن معاملات میں اللہ کی طرف سے رہنمائی کی ایک شکل ہے، جن کا ادراک نری عقل سے نہیں ہوسکتا، اور چونکہ وحی کا مشاہدہ انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی اور کو نہیں ہوتا، اس لئے اِس کی ٹھیک ٹھیک کیفیات کا اندازہ بھی دوسروں کے لئے ممکن نہیں، یہی وجہ ہے کہ آج کی وہ دنیا جو مغربی افکار کے ہمہ گیر سیلاب سے مرعوب ہے، اسے یہ باتیں نامانوس اور اجنبی معلوم ہوتی ہیں اور وہ انہیں شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتی ہے، پھر بعض وہ ہیں جو اس کا کھل کر انکار تو نہیں کرتے، لیکن "سائنٹفک ترقیات" کے اس دور میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے شرماتے ضرور ہیں، اس لئے یہاں مختصراً یہ بھی سمجھ لیجئے کہ خالص عقلی اعتبار سے وحی کی کیا حیثیت ہے؟

ہمارے نزدیک وحی کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے سب سے پہلے طے کرنے کی بات یہ ہے کہ اس کائنات کا کوئی خالق و مالک ہے یا یہ خود بخود بغیر کسی کے پیدا کئے ہوئے وجود میں آ گئی ہے؟ جہاں تک اُن مادہ پرست لوگوں کا تعلق ہے جو سرے سے خدا کے وجود ہی کے منکر ہیں اُن سے تو وحی کے مسئلہ پر بات کرنا بالکل بے سود ہے، جو شخص خدا کے وجود ہی کا قائل نہ ہو اس کیلئے ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ وحی کی حقیقت پر سنجیدگی کے ساتھ غور کر کے اُسے دل و جان سے تسلیم کر لے، اس لئے اِس سے تو سب سے پہلے خدا کے وجود پر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے، رہے وہ لوگ جو خدا کے وجود کے قائل ہیں سو اُن کے لئے وحی کی عقلی ضرورت، اس کے امکان اور حقیقی وجود کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں۔

اگر آپ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ یہ کائنات ایک قادر مطلق نے پیدا کی ہے وہی اس کے مربوط اور مستحکم نظام کو اپنی حکمت بالغہ سے چلا رہا ہے، اور اسی نے انسان کو کسی خاص مقصد کے تحت یہاں بھیجا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نے انسان کو پیدا کر کے اُسے اندھیرے میں چھوڑ دیا ہو اور اُسے یہ تک نہ بتایا ہو کہ وہ کیوں اِس دنیا میں آیا ہے؟ یہاں اس کے ذمہ کیا فرائض ہیں؟ اِس کی منزل مقصود کیا ہے؟ اور وہ کس طرح اپنے مقصد زندگی کو بروئے کار لا سکتا ہے؟ کیا کوئی شخص جس کے ہوش وحواس سلامت ہوں ایسا کر سکتا ہے کہ اپنے کسی نوکر کو ایک خاص مقصد کے تحت سفر پر بھیج دے، اور اسے نہ چلتے ہوئے اس کے سفر کا مقصد بتائے اور نہ بعد میں

کسی پیغام کے ذریعہ اس پر واضح کردے کہ اسے کس کام کیلئے بھیجا گیا ہے اور
اسکی ڈیوٹی کیا ہوگی؟ جب ایک معمولی قسم کا انسان بھی ایسی حرکت نہیں کرسکتا تو
قدوس کے بارے میں یہ تصور کیسے کیا جا سکتا ہے، جس کی حکمت بالغہ سے کائنات کا
چل رہا ہے؟ یہ آخر کیسے ممکن ہے کہ جس ذات نے چاند، سورج، آسمان، زمین
سیاروں کا ایسا محیر العقول نظام پیدا کیا ہو وہ اپنے بندوں تک پیغام رسانی کا کوئی ایسا
کر سکے، جس کے ذریعہ انسانوں کو انکے مقصدِ زندگی سے متعلق ہدایات دی جائیں
تعالیٰ کی حکمت بالغہ پر ایمان ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اُس نے اپنے بندوں کو
نہیں چھوڑا ہے بلکہ اُن کی رہنمائی کیلئے کوئی باقاعدہ نظام ضرور بنایا ہے، بس
باقاعدہ نظام کا نام وحی و رسالت ہے۔

اس سے صاف واضح ہے کہ "وحی" محض ایک دینی اعتقاد ہی نہیں ایک عقلی ضرو
جس کا انکار درحقیقت اللہ کی حکمت بالغہ کا انکار ہے، رہی یہ بات کہ وحی کے جو طریقے
کئے گئے ہیں وہ ہماری سمجھ میں نہیں آتے، سو یہ وحی کو تسلیم نہ کرنے کی کوئی علمی دلیل نہیں
چیز کی عقلی ضرورت اور اس کا وقوع ناقابل انکار دلائل سے ثابت ہوا سے محض اس بنا پر
جا سکتا کہ ہم نے اس کا مشاہدہ نہیں کیا، آج سے چند سو سال پہلے اگر کسی شخص کے سامنے
جاتا کہ عنقریب انسان ہوائی جہاز میں پرواز کر کے ہزاروں میل کا فاصلہ چند گھنٹوں میں
کریں گے تو وہ یقیناً اسے پریوں کا افسانہ قرار دیتا، لیکن کیا اس کے مشاہدہ نہ کرنے
جہاز کی حقیقت ختم ہوگئی ہے؟ آج بھی پسماندہ علاقوں کے ہزار ہا افراد ایسے ہیں جو
ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ انسان چاند پر پہنچ گیا ہے، لیکن کیا ان کے انکار کرنے
غلط ثابت ہو گیا ہے؟ دیہات میں جا کر کسی آدمی سے کمپیوٹر سسٹم کی تفصیلات بیان کیجئے
بتائیے کہ کس طرح ایک مشین انسانی دماغ کا کام کر رہی ہے، وہ آپ کے بیانات پر
شک و شبہ کا اظہار ہی کرتا رہے گا، لیکن کیا ان شکوک و شبہات سے کمپیوٹر کے وجود کا
ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں، تو وہ وحی جس کی عقلی ضرورت مسلم اور ناقابل انکار ہے
مشاہدہ دنیا کے ایک لاکھ چوبیس ہزار صادق ترین انسانوں نے کیا ہے (علیہم السلام)

ان شکوک وشبہات کی بنا پر کیسے جھٹلایا جا سکتا ہے؟

اور آخر وحی کے ان طریقوں میں عقلی بعد کیا ہے؟ کیا معاذ اللہ خدا تعالیٰ کو وحی کے ان طریقوں پر قدرت نہیں؟ اگر دنیا کے سائنسدان محض اپنی محدود عقل کے بل پر پیغام رسانی کیلئے ٹیلیفون، تار، ٹیلی پرنٹر، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے حیرت انگیز آلات ایجاد کر سکتے ہیں تو کیا اللہ تعالیٰ کو (نعوذ باللہ) اتنی بھی قدرت نہیں ہے کہ وہ اپنے بندوں تک پیغام رسانی کا کوئی ایسا سلسلہ قائم فرمادے جو ان تمام ذرائع مواصلات سے زیادہ مستحکم اور یقینی ہو؟۔

وحی کی حقیقت یہی تو ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا کلام کسی واسطے کے ذریعہ یا بلا واسطہ اپنے کسی پیغمبر پر القاء فرما دیتا ہے، سوال یہ ہے کہ اس بات کو درست تسلیم کر لینے میں عقلی قباحت کیا ہے؟ وحی کے ثبوت میں کسی انسانی ایجاد یا عمل کی مثال پیش کرتے ہوئے ہمیں تامل ہوتا ہے، لیکن بات کو سمجھنے کیلئے یہاں ہم ایک ایسے انسانی عمل کو بطور نظیر پیش کرتے ہیں جس میں ایک انسان دوسرے کے قلب ودماغ کو مسخر کر کے اس میں جو خیال چاہتا ہے ڈال دیتا ہے۔

اس عمل کو صوفیاء کی اصطلاح میں ''تصرفِ خیالی'' کہا جاتا ہے، صوفیاء کرام کے تذکروں میں اس عمل کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں، جس کے ذریعہ ایک شخص اپنی خیالی قوت کے زور سے دوسرے کے دل ودماغ پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ اس سے جو چاہتا ہے کہلاتا ہے، اور جو چاہے کرواتا ہے مادہ پرست لوگ ایک مدت تک اس ''تصرف'' کی قوت کا بھی انکار کرتے رہے، اور انہی کی تقلید میں بہت سے مسلمانوں نے بھی اسے قصہ کہانی سے تعبیر کیا، یہانتک کہ اٹھارہویں صدی کے وسط میں سوئٹزرلینڈ کا مشہور ماہر طبیعیات میسمر (Mesmer) پیدا ہوا۔ اس نے انسانی دماغ کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور ۱۷۷۵ء میں اپنے مقالے کے ذریعے یہ انکشاف کیا کہ ایک مقناطیسی عمل کے ذریعے انسان کے دماغ کو مسخر کیا جا سکتا ہے، اس عمل کو وہ مقناطیسی عمل تنویم (Anima Mesnetism) کہتا تھا اور فرانس میں مقیم رہ کر اس نے کامیاب عملی تجربے بھی کئے، لیکن وہ اپنے زمانے کے لوگوں کو پوری طرح مطمئن نہ کر سکا، پھر ۱۸۴۲ء میں انگلینڈ میں ایک اور شخص جیمس بریڈ (James Braid) پیدا ہوا، جس نے اس عمل تسخیر کو سائنٹفک بنیادوں پر از سر نو ثابت کر کے اس کا نام عملِ تنویم یا ہپناٹزم (Hypnotism) تجویز کیا۔

جیمس بریڈ کے تجویز کردہ ہپناٹزم میں مختلف موارج ہوتے ہیں، اس کا انتہائی درجہ تو یہ ہے کہ جس شخص پر یہ عمل کیا جائے یعنی معمول (Hypnotised) اس کے جسم کے عضلات واعصاب بالکل جامد اور بے حس ہو جاتے ہیں، اور اسی کے ساتھ حواسِ ظاہرہ و با معطل ہو جاتے ہیں، لیکن اس کا ایک درمیانی درجہ بھی ہے، جس میں جسم بے حس و حرکت نہ ہوتا، اس کیفیت کا حال بیان کرتے ہوئے ورلڈ فیملی انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے

"اگر تنویم کا عمل ذرا ہلکا ہوتا تو معمول اس لائق رہتا ہے کہ مختلف اشیاء کا تصور کر سکے، مثلاً حالت میں یہ ممکن ہو کہ وہ (عامل کی ہدایت کے مطابق) اپنے آپ کو کوئی اور شخصیت تصور کر لے، اسے کچھ خاص چیزیں (جو وہاں فی الواقعہ موجود نہیں ہیں) نظر آنے لگیں، یا وہ غیر مو حس اپنے اندر محسوس کرنے لگے، اس لئے کہ وہ اس وقت عامل کی ہدایت کا تابع ہو جاتا ہے"

جیمس بریڈ کی تحقیقات اور تجربات کے بعد ہپناٹزم کو ان مادہ پرست لوگوں نے بھی مان لیا پہلے اس کے قائل نہ تھے، اور آج کل تو مغربی عوام کی دلچسپی کا بہت بڑا موضوع بنا ہوا ہے، سینکڑوں عامل اس کے ذریعہ روپیہ کما رہے ہیں، مریضوں کے علاج میں بھی اس سے کام لیا جا رہا ہے، اور "تصرفِ خیالی" جس کا ذکر مسلمان صوفیاء کرام کے یہاں صدیوں سے چلا آتا تھا اور جس کو محض توہم پرستی کہہ کر ٹال دیا کرتے تھے، اب ہپناٹزم کے نام سے ایک حقیقت بن گیا ہے، اور ہمارے زمانے کے وہ نام نہاد "عقلیت پسند" بھی اسے تسلیم کرنے لگے ہیں جنھیں مسلمانوں کی ہر معمولی بات توہم پرستی اور مغرب کی ہر دریافت سائنٹفک حقیقت نظر آتی ہے،

بہرکیف! عرض کرنا یہ تھا کہ مسمریزم ہو یا ہپناٹزم، اس کی حقیقت اس کے سوا اور کیا ہے کہ ایک انسان دوسرے کو مسخر کر کے اپنے خیالات اور اپنی باتیں اس کے دل و دماغ میں ڈال دیتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ جس خدا نے انسان کے "تصرفِ خیالی" یا عملِ تنویم میں اتنی قوت رکھی ہے کہ وہ معمولی معمولی مقاصد کے لیے بلکہ بعض اوقات بالکل بیکار دوسرے کے دماغ و دل کو مسخر کر لیتا ہے، کیا وہ خود اس بات قادر نہیں ہے کہ انسانیت کی ہدایت کی خاطر ایک پیغمبر کے قلب کو مسخر کر کے اپنا کلام اس میں ڈال دے؟ **سبحانك هذا بهتان عظيم**،

کیا قرآن کے صرف معنی وحی ہیں؟ اوپر ذکر آ چکا ہے کہ وحی کی دو

ہیں، ایک وحی متلو یعنی قرآن کریم، اور دوسری وحی غیر متلو، اس دوسری قسم میں تو عموماً یہ ہوا ہے کہ صرف مضامین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے تھے اور انھیں تعبیر کرنے کے لئے الفاظ کا انتخاب حضرت جبرئیل علیہ السلام یا آنحضرت ﷺ فرماتے تھے، لیکن قرآن کریم کا معاملہ یہ نہیں، وہ لفظاً اور معنیً پورا کا پورا اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، جس طرح اس کے مضامین اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں اسی طرح اس کے الفاظ بھی من وعن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں، اور ان کے انتخاب یا ترکیب وانشاء میں نہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا کوئی دخل ہے نہ آنحضرت ﷺ کا،

جو لوگ وحی کے بارے میں مادہ پرستوں کے اعتراضات سے مرعوب ہیں ہمارے زمانے میں ان میں سے بعض نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن کا صرف مفہوم بذریعہ وحی نازل ہوا تھا، اور (معاذ اللہ) اس کے الفاظ اور ترکیبیں وغیرہ سب حضرت جبرئیل علیہ السلام کی یا آنحضرت ﷺ کی ہیں، لیکن یہ خیال بالکل باطل، مہمل اور قرآن وسنت کے صریح دلائل کے بالکل خلاف ہے،

قرآن کی بہت سی آیات اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ اس کے الفاظ اور معانی دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں، اس کے چند دلائل درج ذیل ہیں۔

(۱) قرآن کریم نے جا بجا اپنی صفت ''عربی'' بیان فرمائی ہے یعنی یہ کہ اسے عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے، اب ظاہر ہے کہ اگر قرآن کا صرف مفہوم بذریعہ وحی نازل ہوا ہوتا تو **انا انزلنہ قرانا عربیا** کے کوئی معنی ہی نہ تھے، کیونکہ عربیت الفاظ کی صفت ہے معانی کی نہیں،

۲۔ قرآن کریم میں کئی جگہ آنحضرت ﷺ کے تین فرائض منصبی بیان فرمائے گئے ہیں،

یتلو علیہم ایتک ولعلمہم الکتب والحکمۃ ویزکیہم
(البقرہ ۱۲۹)

''ان کے سامنے تیری آیتیں تلاوت کریں، اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیں اور انھیں پاک صاف بنائیں''۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ ؑ کے ذمہ دو فرائض الگ الگ تھے، ایک آیات اللہ کی صرف تلاوت اور دوسرے اُن کی تعلیم، ظاہر ہے کہ تلاوت الفاظ کی ہوتی ہے معنی کی نہیں، لہذا آپ ؑ کے

سب سے پہلے فریضہ منصبی کا نقش ...

۳۔ قرآن کریم نے جابجا اپنے لیے "الکتب" کا لفظ استعمال فرمایا ہے، اور لفظ "کتاب"
اطلاق صرف ذہنی مضامین پر نہیں ہوتا، بلکہ جب اُن مضامین کو الفاظ کے سانچے میں ڈھال
جاتا ہے تب اسے کتاب کہتے ہیں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن کے لفظ اور معنی دونوں منزل
من اللہ ہیں'

۴۔ سورۂ قیامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی لے کر آتے
آنحضرت ﷺ اسے یاد کرنے کے لیے جلدی جلدی الفاظ دہراتے تھے، تو اس پر باری تعالیٰ
حکم دیا کہ۔

لا تحرك به لسانك لتعجل به o ان علينا جمعه وقرانه o فاذا قرانه o فاتبع قرانه o ثم ان علينا بيانه o (القیمہ: ۱۶ تا ۱۹)

نہ چلا تو اس کے پڑھنے پر اپنی زبان تا کہ جلدی اس کو سیکھ لے، وہ تو ہمارا ذمہ ہے اس کو جمع کر دینا تیرے سینے میں اور پڑھنا (تیری زبان سے) پھر جب ہم پڑھنے لگیں (فرشتہ کی زبانی) ساتھ رہ اسکے پڑھنے کے، پھر مقرر ہمارا ذمہ ہے اسکو کھول کر بتانا۔

یہ آیت صراحۃً دلالت کر رہی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام جو الفاظ لے کر آتے تھے اللہ تعالیٰ کا کلام ہوتا تھا، اسی لیے اس کے الفاظ یاد کرانے، اس کی تلاوت کا طریقہ سکھانے اور اس کے معانی کی تشریح کرنے کے تینوں کام اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لئے ہیں، اور واضح دلائل کی روشنی میں یہ گمان بالکل باطل ہو جاتا ہے کہ الفاظ قرآن وحی کے ذریعے نازل نہیں کئے گئے، اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے شیخ محمد عبدالعظیم زرقانیؒ نے بڑی اچھی بات لکھی ہے فرماتے ہیں کہ:۔

"اس مقام پر بحث کا لب لباب یہ ہے کہ قرآن کریم کے تو الفاظ اور معنی دونوں بالاتفاق بذریعہ وحی نازل ہوئے ہیں، اور احادیث قدسیہ کے بارے میں بھی مشہور قول یہی ہے کہ ان کے الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، البتہ احادیث نبویہؐ کے صرف معنی وحی ہیں، الفاظ حضور ...

اپنے ہیں، اور جو احادیث آپ نے اپنے اجتہاد سے ارشاد فرمائیں ان کے معنی اور الفاظ دونوں حضورؐ کے ہیں"۔

دراصل جن لوگوں نے الفاظِ قرآن کے وحی ہونے سے انکار کیا ہے ان کے اس مغالطے کا منشاء یہی ہے کہ وحی کے ذریعے الفاظ کا نزول ان کی سمجھ میں نہ آسکا، لیکن وحی کی حقیقت اس عمل کی عقلی ضرورت اور اس پر عقلی شبہات کے جواب میں جو باتیں اوپر لکھی گئی ہیں ان کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ شبہ خود بخود دور ہو جاتا ہے، اگر وحی واقعۃً ایک ضرورت ہے اور باری تعالیٰ اس پر قادر ہے، تو آخر کون سی معقول وجہ ہے کہ وہ معنی تو نبی کے قلب پر اتار سکے اور الفاظ اتارنے پر (معاذ اللہ) قادر نہ ہو؟ یہاں یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ علامہ بدرالدین زرکشی اور علامہ سیوطیؒ نے بھی بعض لوگوں کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک صرف مضامین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، الفاظ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے یا حضورؐ کے ہیں، لیکن آپ نے دیکھا کہ قرآن وسنت اور اجماع امت کے مضبوط دلائل کی روشنی میں یہ اقوال بالکل باطل ہیں، مذکورہ بزرگوں نے بھی ان اقوال کے قائلین کا کوئی حوالہ نہیں دیا، بلکہ **قال بعضهم** (بعض لوگوں نے کہا ہے) کہہ کر یہ اقوال نقل کر دیئے ہیں، اور علامہ سیوطیؒ نے تو اس کی صراحۃً تردید بھی کی ہے، اس لئے ان اقوال کو اس مذہب باطل کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔

صوفیاء کا انداز فکر

(صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی

ہمارے ہاں بالعموم انقلاب اور تصوف کو ایک دوسرے کا مخالف سمجھنے کا رجحان موجود ہے
کہا جاتا ہے کہ تصوف ہے کیا؟ محض نظام خانقاہی، فقط ذکر و فکر، مجرد چلہ کشی، صرف ضربات
ہو، ترک دنیا، مردم بیزاری، آتش خاموش کی تلاش، فناء کی جستجو اور دروں بینی اور نہ جانے کن
القاب و اسماء سے بیچارے تصوف کو یاد کیا جاتا ہے، جس طرح کوئی مسافر کسی اجنبی شہر
جائے اور جو سلوک اہل شہر اس سے کرتے ہیں ویسا ہی برتاؤ اہل دنیا نے تصوف کے ساتھ
جب یہ ترک و ایثار کا مذہب، فقر و غنا کا مسلک، غیرت و حمیت کا مشرب، آفاقیت کا
اخلاص و احسان کا رویہ اور قناعت و سادگی کا حوالہ اجنبی دیس میں آ گیا اور اسے واسطہ پڑا
ہوس کے بندوں، دولتمندوں اور جاہ پسندوں، بے ضمیری و مردہ دلی کے بزدلوں اور
کیشوں سے تو انہوں نے فوراً ڈھنڈورا پیٹ دیا کہ یہ ترک دنیا کا سبق دیتا ہے، یہ خدا کی
چیزوں سے محروم کرتا ہے یہ کاروبار دنیا کا برا سمجھتا ہے اور یہ مشاغل زندگی اور آداب شہر
چھوڑنے کی بات کرتا ہے، گویا لوگوں کے نزدیک دین، ایمان اور شریعت بس یہی ہے کہ
کھاؤ، بناؤ اور بال بچوں کے لئے چھوڑ جاؤ ظاہر ہے اس خانہ زاد شریعت اور گھڑ تو فلسفہ
میں فقر، استغناء، ریاضت، صبر، مجاہدہ، احسان، ایثار اور رواداری کا کیا مقام ہو سکتا ہے؟ اگر
مقام ہوتا تو صوفیاء طعنوں کی سانگ پر کیوں چڑھائے جاتے؟ آخر یہ چیخ و پکار، یہ داد
فغاں اور ہائے وائے کیوں ہے؟ صوفیاء نے خود شہر چھوڑے ہیں کسی بستی پر حملہ آور تو نہیں ہو
اپنے گھروں کو خیر باد کہا ہے کسی کا گھر تو نہیں اُجاڑا، خود کھانا پینا ترک کیا ہے کسی کے منہ
نہیں چھینا، خود لنگوٹ پر قناعت کی ہے کسی کے تن سے کپڑا تو نہیں اُتارا، خود شب و روز
کوترسے ہیں کسی کے چین میں خلل تو نہیں ڈالا، جب یہ سب جانتے اور مانتے ہیں تو پھر شور
کس لئے؟ دراصل معاملہ یہ ہے کہ فقراء اور صوفیاء کے چلے اور مجاہدے، ریاضتیں اور
نہیں کھٹکے بلکہ ان کا طرز زندگی بندگان سیم و زر کیلئے موت کا پیغام تھا، صوفیاء کے انداز
دین کے پردے میں دنیا پرستی، تبلیغ کی آڑ میں زراندوزی اور علم کے چلمن میں جاہ
نقاب کیا ان کی مسکینی نے سرمایہ داروں کو للکارا، ان کی زحمت کشی نے عیش کوشوں کو رسوا

سادگی نے مترفوں اور مسرفوں کو ننگا کیا، ان کی غیرت فقر نے کاسہ لیسوں کو شرمندہ کیا، ان کی رواداری نے مذہبی بازی گروں کا پول کھولا، ان کی انسان دوستی نے خونخواروں کے جبڑے توڑے ان کی خاک نشینی نے تخت و تاج والوں کو چیلنج کیا، ان کی کفنی اور لنگوٹ نے مبلبوں، قباؤں، جبوں، قبوں، عماموں، طرّوں اور کلاہوں کی عظمت پامال کی، ان کی جھونپڑی نے کاخ و ایوان کو کھوکھلا کیا، ان کی تنہائی نے درباروں کی رونق گھٹائی، اگر ایسا نہیں ہوا تو اس "بے ضرر مخلوق" کے پیچھے ایک ہی وقت میں حکمران، مولوی، سرمایہ دار، وڈیرے، مفتی اور کوتوال کیوں پڑ گئے؟ کوئی نہ کوئی ان کی دکھتی رگ تو تھی جس پر ان کی انگلی جا پڑی اور یہ سب چیخ اٹھے، آج ان مفتیوں، قاضیوں اور درباریوں کی اولاد ان فقیروں کی مخالف ہے جب یہ فقیر روکھی سوکھی پر گزارا کر رہے تھے اور عمامہ پوش شاہی دستر خوانوں پر مرغ و ماہی کی قابیں اڑا رہے تھے، جب یہ فقیر اپنے شکستہ جھونپڑے میں سربگریباں تھے تو نام نہاد دانشور دربارِ شاہی میں فرشی سلام کرنے میں مصروف تھے جب یہ فقیر محض "فقیر" ہی کہلاتے تھے اور زر پرست "عمائدین ملت" شیخ الاسلام کے نام سے یاد کئے جاتے تھے، جب یہ اپنی غیرت فقر کی حفاظت میں لگے ہوئے تھے اور رہنمایان قوم" قاضی القضاۃ" بنے بیٹھے تھے، کہاں یہ بلندی کردار اور کہاں وہ پستی افکار، سچ ہے کبھی بندگان رب اور بندگان زر کی بن نہیں آئی، لہٰذا ہمیں فیصلہ کرنا چاہیے کہ ہمیں کیسا انقلاب درکار ہے؟ ہمیں فقر مطلوب ہے یا زر؟ ہم عزت کے طالب ہیں یا خدمت کے خواہشمند، خودی کا تحفظ مقصود ہے یا گدی کی بقا، اپنی جنت آپ بنائیں یا دوسروں کے ٹکڑوں پر گزارا کریں؟ اگر ہمیں غیرت فقر جذبہ خدمت اور احساس خودی مطلوب ہے تو یہ چیزیں کسی مکتب، مدرسہ، کالج، دانشگاہ اور کتاب میں نہیں ملیں گی بلکہ ان کا سرچشمہ امام الفقراء جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ اور صوفیاء کرام کی تعلیمات عالیہ ہیں۔

انقلاب گفتار کا نام نہیں کردار کا نام ہے اور صوفیاء کا کردار انقلاب کی ضمانت ہے، کوئی بڑے سے بڑا الزام تراش کسی صوفی پر یہ بہتان تو لگا نہیں سکتا لگالے تو ثابت نہیں کر سکتا کہ کوئی صوفی کاسہ لیس ہو گزرا ہے، کبھی دباؤ میں آیا ہے، کسی کے دام دولت و سلطنت میں الجھا ہے، کسی کے خون ناحق کا ذمہ دار ہے، کبھی دین کو بازیچہ اطفال بنایا ہے، کسی فاسق حکمران کو "ظل اللہ" تسلیم کیا ہے، کسی بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھا ہے، کسی وڈیرے کی نگاہ عنایت کا محتاج رہا ہے، کبھی

غیرت فقر نیلام کی ہے، کبھی عہدوں کے پیچھے بھاگا ہے، کسی مسند نشین کو کورنش بجالایا ہے، ...
کے مقابلہ میں وہ مولوی، مفتی اور قاضی ہی تھے اور ان کی پشت پر ارباب زر و جاگیر تھے ...
نے امام حسین رضی اللہ عنہ کے خون کو مباح اور ان کے خروج کو بغاوت قرار دیا، امام مالکؒ کو ...
پرداز بتلایا گیا، امام اعظمؒ کو جیل بھجوایا، امام غزالیؒ پر زندیق کا فتویٰ چسپاں کیا اور ان کی کتابیں ...
ڈالنے کا فتویٰ دیا، امام احمد بن حنبلؒ کی سزا کی توثیق کی، عہدوں کے عوض زندگی بھر محلات کا طواف
کرتے رہے، ہر دور کے حکمران کو امیر المومنین اور ظل اللہ بنا ڈالا، انقلاب صوفی کے تقویٰ کا ...
ہے کسی معاوی کے فتوی کا نہیں، انقلاب حمیت کا راستہ ہے مصلحت کا نہیں، انقلاب غیرت ...
علامت ہے مصالحت کی نہیں، انقلاب مفادات سے دستبرداری کی بات کرتا ہے مصدر ...
نہیں، پھر کیوں نہ انقلاب کی صوفیانہ تعبیر کو قبول کیا جائے؟

انقلاب کی صوفیانہ تعبیر کے ضمن میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ دیکھا جائے اس ...
معاشرے کو درپیش سنگین مسائل کیا ہیں؟ اولاً ان کا ادراک حاصل کیا جائے اور ثانیاً ان کا ...
ڈھونڈھا جائے مگر ہمارے مذہبی حلقوں کے نزدیک معاشرتی مسائل کوئی اہمیت ہی نہیں ...
بلکہ ان کے ہاں کچھ اس طرح کے مسائل زیادہ اہم اور فوری طور پر فیصلہ طلب ہیں۔

☆ خدا حاضر ناظر ہے یا رسول ﷺ بھی؟
☆ نبی اپنی قبر میں زندہ ہیں یا نہیں؟
☆ اولیاء اللہ سے مدد مانگنا جائز ہے یا نہیں؟
☆ حضور ﷺ دیوار کے پیچھے کا علم رکھتے ہیں یا نہیں؟
☆ معراج جسمانی ہے یا روحانی؟
☆ قرآن مجید مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟
☆ قرآن مجید کی کتنی آیات ناسخ ہیں اور کتنی منسوخ؟
☆ داڑھی کی شرعی مقدار کتنی ہے؟
☆ لاؤڈ سپیکر پر نماز درست ہے یا نادرست؟
☆ تصویر اتروانا ممنوع ہے یا مباح؟
☆ پختہ قبر بنانا صحیح ہے یا غلط؟

☆ دنیا میں کل کتنے ابدال ہیں؟

☆ نوافل با جماعت ادا ہو سکتے ہیں یا نہیں؟

☆ کھڑے ہو کر اور چمچے کے ساتھ کھانا کھانا کیسا ہے؟

☆ حد شرعی میں ہاتھ انگلیوں سے کاٹا جائے یا پہنچوں سے؟

☆ شلوار پہننا سنت ہے یا تہبند باندھنا؟

☆ فاتحہ کا ثواب مردوں کو پہنچتا ہے یا نہیں؟

☆ جنازہ کی تکبیریں چار ہیں یا پانچ؟

☆ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں کی تعداد کتنی ہے؟ ایک یا چار؟

☆ جرابوں پر مسح کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

☆ تراویح کی کل رکعتیں بیس ہیں یا آٹھ؟

☆ عید کے روز معانقہ کرنا سنت ہے یا بدعت؟

یہ ہے ان اہم مسائل کی ایک جھلک جسے مذہبی دنیا میں **معرکۃ الآراء** سمجھا جاتا ہے اور ان مسائل کی توضیح و تنقیح پر نہ جانے کتنا لٹریچر تیار کیا گیا ہے، کتنے مناظرے ہوئے، کتنے فتوے داغے گئے، کتنے "علمی دنگل" برپا ہوئے، کتنا سرمایہ لگا، کتنا وقت برباد ہوا، کتنی صلاحیتیں صرف ہوئیں، کتنی نفرتیں اُبھریں، کتنے تفرقے پڑے اور کیا کیا کچھ ہوا شاید اس کا شمار کوئی جدید ترین کمپیوٹر بھی نہ کر سکے، مگر اس ساری بحث اور تمحیص کے باوجود عوام کے دکھوں کا مداوا نہ ہوا، یہ بحثیں جاری ہیں اور جاری رہیں گی، مگر ان کا کسی معاشرتی روگ پر اثر نہ پڑا، رشوت جوں کی توں رہی، نظام زر کے مظالم برقرار رہے، انصاف بکتا اور خریدا جاتا رہا، قتل ہوتے رہے، ڈاکے پڑتے رہے، عصمتیں لٹتی رہیں، مزارع بے دخل ہوتے رہے، مزدور محروم روزگار بنتے رہے اور غریب کی زندگی بوجھل ہوتی رہی، الغرض ہر شیطانی مشغلہ بدستور رہا، اب آیئے صوفیاء کی تعلیمات کی طرف، جنہیں اگر مکتب و مدرسے اور دانشگاہ میں قرار واقع جگہ دی جائے تو فکر عمل کی دنیا میں فی الواقع ایک پرشکوہ اور عظیم الشان انقلاب برپا ہو سکتا ہے، صوفیاء کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ جسے پڑھنے اور سمجھنے کے لئے انصاف، اخلاص اور بے میل رویہ درکار ہے۔

☆ سفا کی، ظلم و تشدد، اور حیوانیت کی جگہ "جوہر انسانیت" کو اجاگر کیا جائے۔

وطنیت، قومیت، رنگت اور لسانیت کے تنگ دائروں سے نکل کر "آفاقیت" آشنا...

☆ تعصب، تنگ نظری، کم نگہی اور نفرت کے بجائے "رواداری" کا سبق عام...

☆ ریا، نمود و نمائش، تصنع اور تکلف چھوڑ کر "اخلاص" کا رویہ اپنایا جائے۔

☆ سطحیت سے دستکش ہوکر "احسان" (فی الوالقول والعمل) کو رواج دیا جائے۔

☆ استحصال، لوٹ کھسوٹ اور سلب و نہب سے منہ موڑ کر "ایثار" پیشہ...

کی جائے۔

☆ جلد بازی، اور شکوہ شکایت کا ماحول بدل کر "صبر" کی فضا تیار کی جائے

☆ زر اور زمین کو سب کچھ سمجھنے کی بجائے "توکل" کی روح بیدار کی جائے۔

☆ چاپلوسی، خوشامد، مفاد عاجلہ اور ضمیر فروشی ترک کر کے "استغنا" کا مظاہرہ...

☆ ہوس، حرص، طمع اور زر پرستی جیسے قبیح اوصاف کا "فقر" سے قلع قمع کیا جائے۔

☆ جلب منفعت اور تاجرانہ ذہنیت ختم کر کے "قناعت" کو شعار بنایا جائے۔

☆ بدعنوانی، قانون شکنی، مکر و تلبیس اور بے لگامی کو فن سمجھنے کے بجائے "تقویٰ"...

پیدا کی جائے۔

☆ مصلحت کیشی اور پست ہمتی کے علی الرغم "عزیمت و فتوت" کا چلن عام کیا جائے

☆ حاکمیت، چودھراہٹ اور مخدومیت پر "خدمت" کو ترجیح دی جائے۔

☆ دغا کا دستور منسوخ کر کے "آئین وفا" پر عمل کیا جائے۔

مندرجہ بالا الفاظ مثلاً آفاقیت، رواداری، اخلاص، ایثار، توکل، احسان، صبر، استغنا...
اور خدمت خلق صوفیاء کے منشور کے اہم نکات ہیں ان خاکوں میں رنگ بھرنا زندگی کے تمام...
فرض ہے خواہ وہ حاکم ہے یا رعایا، تعلیمات کا یہ رُخ پوری معاشرت کا قبلہ متعین کر رہا ہے۔
اب اہل نظر کو انصاف کرنا چاہیے کہ کون سی تعبیر انقلاب کے قریب تر ہے اور کون سی...
خود انقلاب پرور ہے صوفیاء کی یا بے روح دانش اور مسخ شدہ فرقہ واریت کے علمبرداروں...
اگر کتابی قسم کی مذہبی تعبیر کے ذریعے انقلاب برپا کرنے کی خواہش کی جائے اور...
آ بھی جائے تو بھی قیامت تک کسی مجرم، قاتل، قاذف اور ڈاکو کی سزا کا تعین نہیں ہو...
و بدعت کی تعریف متعین کرنے میں عمر عزیز کا خاصہ حصہ صرف ہو جائے گا، گواہی کی...

گواہوں کی تعداد کا مسئلہ مختلف فیہ رہے گا، قانون کی روح کے بجائے اس کی معماتی اور چیستانی شقیں زیرِ بحث رہیں گی اور مذہب کے نام پر یہ تقسیم وتفریق معاشرے کو قتل گاہ بنا دے گی اگر صوفیانہ طرز انقلاب اپنالی جائے تو رواداری اس درجے کی ہوگی کہ کسی فریق مخالف تو کجا کافر تک کی روٹی بند نہیں ہوگی اور نہ ہی اس کا خون اس کی ناموس کیلئے مباح ہوگی، سنت و بدعت کے جھگڑے کی جگہ ذوق عمل اُبھرے گا، صوفیانہ انقلاب میں فقیروں کے جھونپڑے اور امیروں کے محل دیوار بدیوار نہیں ہوں گے، کسی عیش کدے کی رونقیں کسی کلبہ احزان میں ماتم برپا نہیں کریں گی، کسی گھر سے کباب اور بھنے ہوئے گوشت کی اُٹھنے والی خوشبو غریب ہمسایہ کے منہ میں پانی نہیں لائے گی، کوئی جاگیردار اور سرمایہ دار جاگیر اور سرمائے کے بل بوتے پر کسی کی عزت سے نہیں کھیل سکے گا، کوئی حکمران یزید، چنگیز اور ہلاکو کا جانشین نہیں بن سکے گا، انقلاب کی صوفیانہ تعبیر کے نتیجے میں اگر ملک کے اندر دودھ اور شہد کی نہریں جاری نہ ہوئیں، جنت کی ہوائیں نہ چلیں، محلات نہ بنے، حور و غلمان نہ ملے، الہ دین کا چراغ نہ جلا، کرشمے ظاہر نہ ہوئے، بلقیس کا تخت نہ آیا اور سونے کے کنگن پہننے کو نہ ملے تو کم از کم یہ بھی نہیں ہوگا کہ ایک طرف بنگلے تعمیر ہوں اور دوسری طرف کسی کے جھونپڑے کی چھت بارش سے ٹپک پڑے، کسی کو انواع واقسام کے کھانے میسر ہوں اور کوئی سوکھی روٹی کو ترسے، کسی کے لئے ہر دن عید اور کسی کے لئے ہر رات شام غریباں ہو، کسی کے کتے لحاف اوڑھیں اور کسی کے بچے چیتھڑوں میں ٹھٹھرتے رہیں، کوئی کھا کر بیمار ہو اور کوئی فاقوں سے علیل! صوفیانہ انقلاب برپا ہونے کی صورت میں زمام کار جن لوگوں کے ہاتھ میں ہوگی وہ اگر لوگوں کو دودھ میں نہ نہلا سکے تو خود بھی ٹھنڈا پانی نہیں پئیں گے، کسی کو مکان میسر نہ آسکا تو خود بھی محلات میں نہیں رہیں گے، کسی کو اپنی سطح پر نہ لا سکے تو خود ہی اس کی سطح پر اُتر جائیں گے، عوام کو امیر نہ بنا سکے تو خود ہی غریب عوام میں شامل ہو جائیں گے۔ خدا گواہ ہے اگر اتنا بھی ہو جائے تو معاشرہ جنت نظیر بن جائے گا اور کچھ نہیں تو کم سے کم دنیا انسانوں کی بستی نظر آئے گی جہاں مروت، خیر خواہی، ہمدردی، مساوات اور احترام آدمیت کے بہترین نمونے ساکنان ارض کو نظر آئیں گے۔

اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدود

(مولانا شاہ محمد جعفر پھلوار

اوپر کی تفصیلات کو نمبر وار دیکھ جائیے۔ حضورؐ نے اصول کی فروع بیان کی ہوں، اجمال کی تفصیل کی ہو، عام کو خاص کیا ہو، الفاظ کی تفسیر کی ہو۔ قرآن سے استنباط کیا ہو بکھرے ہو احکام کو خاص ترتیب سے نافذ کیا ہو۔ یہ سب کچھ واجب الاتباع ہے اور ان سب کی اطا منصب رسالت کی اطاعت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض باتیں کسی موقعے پر رائیں بھی ہوں لیکن ان کی عمومی حیثیت وہی ہے جو وحی رسالت، امر امیر یا قضائے قاضی ہے۔ یہ درست ہے کہ **ما انزل اللہ** صرف قرآن ہے (یا دوسری آسمانی کتابیں) سوال صرف یہ ہے کہ آیا مفسر دین اور مشکل معاشرہ ہونے کی حیثیت سے حضور کی اطاعت ہی واجب ہے۔ جیسی وحی رسالت، امر امیر یا قضائے قاضی کی ہے؟ ہمارے نزدیک کا جواب اثبات میں ہے۔ حضورؐ نے امیر کی حیثیت سے یا قاضی کی حیثیت سے جو کچھ **ما انزل اللہ** تو وہ بھی نہیں لیکن ان کی اطاعت اسی طرح فرض ہے جس طرح وحی رسا **ما انزل اللہ**) کی یعنی اس کی اطاعت ایسی ہی واجب ہے جیسی رسول کی حیثیت آنحضرت کی اطاعت بھی عین ایسی ہی اطاعت ہے جیسی اطاعت بحیثیت رسول ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے۔۔۔۔ جیسا کہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ عصری تقاضوں کے آنحضرتؐ کے فرامین میں ردوبدل کی گنجائش موجود ہے اور یہ گنجائش خود ہی رسول ﷺ ہے اس کی تشریح ہم اپنے مختلف مضامین میں کر چکے ہیں۔ اور اس کی بیسیوں مثالیں ہم چکے ہیں۔

۱۔ وحی رسالت کی حیثیت سے یعنی از روئے قرآن آنحضرتؐ مولفۃ القلوب کو دیتے تھے۔ لیکن سیدنا ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں سیدنا عمرؓ کی رائے سے یہ عطیہ بند کر دیا گیا

۲۔ بحیثیت قاضی کے آں حضرتؐ کا فیصلہ تھا کہ بیک وقت تین طلاقیں رجعی ہیں عمرؓ نے اپنے دور میں اسے مغلظہ قرار دیا، اگرچہ بعد میں آپ کو اس پر ندامت ہوئی

(غاشیۃ اللہفان)

۳۔ بحیثیت امیر کے آنحضرتؐ نے خیبر کی مفتوحہ زمین مجاہدوں میں تقسیم فرمائی تھی لیکن جناب عمرؓ نے اپنے عہد میں مفتوحہ زمینوں کی تقسیم بند کردی۔

ایک ضروری بات

یہاں آگے چلنے سے پہلے ایک ضروری بات سمجھ لینا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کرنے کا اختیار رسول اللہ کو بھی نہیں چہ جائیکہ حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کو ہو۔ پھر سوال یہ ہے کہ مولفۃ القلوب کو صدقہ نہ دینے کا فیصلہ حضرات شیخین نے کیوں کیا اور لوگ کیوں اب تک اسے صحیح سمجھتے چلے جارہے ہیں؟ یہ ایک بڑا اہم سوال ہے اور اکثر لوگوں کو ہم نے اس معاملے میں مبتلائے شبہات پایا ہے حالانکہ بات صاف ہے کہ قران کا کوئی حکم بھی منسوخ نہیں۔ نہ کسی کو منسوخ کرنے کا حق پہنچتا ہے۔ ہاں امیر کو آرڈی ننس یعنی وقتی قانون نافذ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ آرڈی ننس کا مطلب یہ ہے کہ اصلی حکم اپنی جگہ قائم رہتا ہے اور امیر صرف یہ کرتا ہے کہ مصالح امت کے لیے وقتی طور پر اسے ملتوی کر دیتا ہے جب ضرورت التوا ختم ہو جاتی ہے تو وہ حکم لوٹ کر اپنے مقام پر آجاتا ہے۔ یوں سمجھیے کہ گوشت کھانا حلال ہے لیکن ایک طبیب کسی مرض سے (یا کسی وبائی موسم میں سبھوں سے) گوشت چھڑوا دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس نے ہر آدمی پر ہمیشہ کے لیے گوشت کو حرام کر دیا ہے۔ بلکہ ایک وقتی ضرورت و مصلحت کے لیے ایسا کیا گیا ہے۔ جب وہ مصلحت نہ رہے گی تو گوشت کی اجازت واباحت اپنے مقام پر لوٹ آئے گی۔ لیکن ہوا یہ کہ سیدنا عمرؓ نے مولفۃ القلوب کو جو صدقات دینا بند کر دیا اسے ہمارے فقہا نے ایک ابدی حیثیت دے دی۔ گویا سیدنا عمرؓ ناسخ قرآن قرار پا گئے۔ اسی طرح جناب عمرؓ ناسخ فضایائے نبوی بھی قرار دیے گئے کیونکہ فیصلہء رسولؐ کے خلاف اپنا فیصلہ دے دیا۔ حالانکہ یہ آپ کا صرف آرڈی ننس تھا۔ جب مصلحت کا تقاضہ ہوگا حضرت عمرؓ کا آرڈی ننس ختم ہو جائے گا۔ اتنی موٹی سی بات سمجھنے میں تو کسی کو دشواری نہیں ہونی چاہیے کہ فرمان الٰہی یا فرمان رسول کو منسوخ کرنے کا حق حاصل ہے اگر مصلحت وقت کا تقاضا ہو۔ آپ اس پر تو بحث کر سکتے ہیں کہ کسی تبدیل حکم کی جو مصلحت بتائی جاتی ہے وہ درست نہیں یا اس کا ابھی وقت نہیں آیا ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہزار عصری تقاضے ہوں مگر حکم نہیں بدلا جا سکتا۔

ایک اسلامی حکومت اس طرح کے آرڈی ننس نافذ کرنے کے حامل اختیارات ہو
مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ گوشت حلال ہے لیکن حکومت اسلامیہ جانوروں کی کمی
آرڈیننس نافذ کر سکتی ہے کہ ہفتے میں اتنے دن ذبیحے نہ ہوں۔ اسی طرح حکومت اسلامی
ازواج پر پابندی لگا سکتی ہے اگر وہ یہ محسوس کرے کہ تعدد ازواج کی قرآنی شرائط پوری نہ
جا تیں۔ یوں ہی اسے یہ اختیارات بھی حاصل ہیں کہ بڑھتی ہوئی آبادی پر کنٹرول
کیلئے آرڈیننس نافذ کردے یا مناکحت کے لئے زن و مرد کو خاص عمروں کا پابند کردے
کے سارے آرڈیننس وقتی ہوں گے خواہ ان کی معیاد مختصر ہو یا طویل۔ جب مصلحت
لے گی تو یہ آرڈیننس بھی واپس لے لیے جائیں گے اور اِن کے متعلق مستقل اقدار اپنی
اپنی جگہ لوٹ آئیں گے۔ یا کوئی اور آرڈیننس نافذ کر دیا جائے گا جو گزشتہ آرڈیننس کے
خلاف ہو، اِن صاف وصریح باتوں کو یا تو جان بوجھ کر یا ناواقفیت کی وجہ سے بعض
"مداخلت فی الدین اور شریعت اسلامیہ کی تبدیلی" اور نہ جانے کیا کیا قرار دیتے ہیں
طرح اپنے ضعفِ استدلال کے خلا کو پر کرنے کی سعی فرماتے رہتے ہیں۔

غرض وہ فرامین رسول بھی واجب الاطاعت ہیں جو مفسر دین یا مشکل معاشرہ کی حیثیت
حضورؐ نے دیئے ہیں۔ لیکن عصری تقاضوں کو ملحوظ رکھنا بھی خود رسولؐ ہی کے فرمان کا اہم
اور اس کی صحت کے ثبوت میں خلفائے راشدینؓ کے طرز عمل سے بہتر اور کونسی دلیل ہو گی

ایک ضروری بات اور بھی یاد رکھنی چاہیے اور وہ یہ ہے کہ اِس حیثیت (مفسر دین
معاشرہ) سے حضورؐ کے جو اقوال و افعال ہیں وہ احادیث و تاریخ میں موجود ہیں اور
اسی ذخیرے کو سامنے رکھنے پر مجبور ہیں۔ لیکن ان تمام ذخائر کو شروع سے آخر تک
نہیں دی جا سکتی۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ جس مولف نے اپنی تالیف میں کسی روایت
درج کیا وہ فی الواقع بھی صحیح ہی ہو۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کا انتساب حضورؐ کی طرف
درج کر لیا ہو۔ روایت و درایت کی پوری چھان بین کے باوجود بھی بعض پہلوؤں کا
اوجھل رہ جانا عین تقاضائے بشری ہے۔ اس قسم کے تسامحات سے ان مولفین کی
فرق نہیں آتا۔ وہ عنداللہ ماجور ہیں لیکن کسی آئندہ دور میں اگر کوئی شخص ان تسامحات

کرے اور دلائل سے یہ واضح کردے کہ فلاں فلاں جن روایات کو انہوں نے صحیح سمجھ کر درج کیا ہے ان کا انتساب آنحضرت کی ذاتِ اقدس کی طرف صحیح نہیں تو ایسے تسامحات کی نشاندہی کرنے والا بھی ان مولفین ہی کی طرح ماجور ہوگا اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ کسی دوسرے دور میں ان نشاندہی کرنے والوں کی غلطی واضح کرنے والے بھی پیدا ہوں تو وہ بھی ماجور ہوں گے۔ یہ سلسلہ نقد و جرح کوئی ختم ہونے والی چیز نہیں۔ نیز اسی طرح مصالح اُمت کی نوعیتیں بھی ختم ہونے والی شے نہیں۔ ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور اُن کا لحاظ رکھ کر نئے نئے قوانین یا آرڈیننس نافذ ہوتے اور منسوخ ہوتے رہیں گے۔ اِس طرح کی جزئی ترمیمات یا ردوبدل ایک متحرک شریعت کے منشاء کے عین مطابق ہیں۔ اور صدیوں پرانی باتوں سے چمٹے رہنا ایسا جمود ہے جس کا زمانے نے نہ کبھی ساتھ دیا ہے نہ دے گا۔

بحمد اللہ ہم اپنے متعلق ابدی صحت و صواب کے کبھی مدعی نہیں رہے ہیں۔ ہمارے بشری فہم میں ہزار غلطیاں ہوسکتی ہیں لیکن نیک نیتی سے ہم ہمیشہ دین کے بعض گوشوں کی تعبیر میں (INTER-PRETATIONS) پیش کرتے رہے ہیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے اور ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہماری تجاویز کو زمانہ آہستہ آہستہ قبول کرتا جاتا ہے۔ ہم نے آج سے چھ سال پہلے یہ تجویز پیش کی تھی کہ اب رویت ہلال کمیٹی کی ضرورت نہیں کیونکہ علم فلکیات اب اس مقام پر پہنچ چکا ہے کہ بڑی آسانی سے طلوعِ ہلال کی پیشگوئی کی جاسکتی ہے۔ اس لئے شہادت کے قدیم طریقے برتنے کی کوئی حاجت نہیں۔ وہی مقصد دوسرے انداز سے زیادہ بہتر طریق پر پورا کیا جاسکتا ہے۔ ہماری اِس تجویز پر اہل علم حضرات نے خاصا تعاقب فرمایا۔ یہ سب حضرات اپنی جگہ نیک نیت تھے۔ لیکن حقیقت حال پر غور نہ فرمانے کی وجہ سے ہماری اس تجویز کو رد کیا۔ تاہم زمانے نے ہمارا ساتھ دیا اور اب رویت ہلال کا فنی فیصلہ افتراق اُمت کے بغیر بھی ہونے لگا ہے اور اب کئی اہل علم اس مسئلے میں ہمارے ساتھ ہوگئے ہیں۔

ہم نے موجودہ حکومت سے بہت پہلے نظام جاگیرداری کو ملک کے لئے ناسور قرار دیا تھا اور انفرادی ملکیت کی لامحدودیت کو محدود کرنے کے حق میں دلائل بھی دیے تھے۔ اس پر بھی مختلف حلقوں کی طرف سے مداخلت فی الدین کا فتویٰ دیا گیا حتیٰ کہ ہندوستان کے کئی جانے پہچانے

ذمہ دار اخباروں اور رسالوں نے بھی ہم پر تبلیغ اشتراکیت ہونے کا شبہ ظاہر کیا۔ مگر ہمیں خوشی ہوئی کہ آخر موجودہ حکومتِ پاکستان نے جاگیرداری کے ناسور کو کسی حد تک ختم کر دیا ہے۔

یہی صورت حال اس وقت پیدا ہوئی جب ہم نے خاندانی منصوبہ بندی کی حمایت میں مضمون لکھے۔ مخالفت ابھی تک جاری ہے لیکن زمانہ اس کا ساتھ دے رہا ہے اور بعض دینی حلقوں کے مخصوص حضرات بھی اس کے قائل ہو گئے ہیں جو زبانی اعتراف تو کرتے ہیں مگر اپنے حلقوں کے دباؤ کی وجہ سے لکھنے کی ہمت نہیں رکھتے۔

بہرکیف ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہمارے بہتیرے دینی تصورات کی تائید اب مختلف حلقوں سے ہوتی جارہی ہے اور زمانے کی باجبروت رفتار خود بخود حقائق کو منواتی جارہی ہے ہماری جو تجاویز معقول ہونگی انہیں زمانہ آخرکار مان ہی لے گا اور جو صحیح نہ ہوں گی انہیں زمانہ ہی ختم کردے گا ہم بہرحال نیک نیتی سے نئی دینی تعبیرات پیش کر رہے ہیں اور اسی تصور کے مطابق ہماری یہ گذارش ہے کہ اگرچہ زیر بحث حیثیت سے بھی آنحضرت کی اطاعت عین مقام رسالت کی اطاعت ہے لیکن اس میں عصری تقاضوں کے مطابق ردوبدل کرنا بھی عین منشائے نبوی ہی کی اطاعت ہے۔ یہ ردوبدل امیر وقت کے آرڈیننس کی حیثیت رکھتی ہے۔ خواہ یہ طویل المیعاد ہو یا قصیر المیعاد۔

اب رہا دوسرا سوال کہ جب قرآن خود اپنے آپ کو مبین کہتا ہے (**تبیانا لکل شئی**) [illegible] رسول کے مبین ہونے کا کیا مطلب ہے؟ یہ ایسا ہی سوال ہے کہ قرآن سراپا حکمت ہے اور اسے ذکر حکیم کہا گیا ہے تو قرآن سے الگ کون سی حکمت ہے جسے قرآن کے ساتھ بیان کیا گیا ہے (**یعلم الکتاب والحکمۃ**) اگر کوئی حکمت ایسی بھی ہے جو قرآن سے الگ ہے اور رسول اس کا معلم ہے تو "تبیین" بھی ایسی ہو سکتی ہے جو قرآنی تبیین سے الگ حیثیت رکھتی ہو۔ قرآن کے احکام اپنی مخصوص ترتیب کے ساتھ تمام احکام کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہیں [illegible] بکھرے ہوئے ہیں۔ ان سب کو معاشرے کے اندر ایک خاص نظم وضبط [illegible] امت کے اندر نافذ کرنا بھی ایک تبیین ہی ہے جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے [illegible] رسالت بھی ہیں جن کا ہم آغاز ہی میں نمبروار ذکر کر چکے ہیں۔ [illegible]

تبیین کی مختلف شکلیں ہیں جو حضورؐ کے سپرد کی گئی تھیں۔ یہ تبیین قرآنی تبیین سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن اپنے آپ کو تفصیل بھی کہتا ہے (**تفصیل کل شئی**) اس کے باوجود آپ اُوپر دیکھ چکے ہیں کہ بعض چیزیں معاشرے کیلئے مجمل تھیں اور آنخضرتؐ نے اُس کی تفصیلات بیان فرمائیں۔ یہ بھی قرآنی تفصیل سے ایک جداگانہ تفصیل ہے اور تبیین میں یہ بھی داخل ہے اگر فی الواقع قرآن خود اپنا آپ کلیۃً مبین ہے تو آخراتنی تفسیریں لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ پس اگر ہم آپ سب تفسیر لکھنے کا حق رکھتے ہیں تو آنخضرت کو سب سے بڑا مفسر قرآن ماننے سے کیا چیز روک سکتی ہے؟ اور کیونکہ تبیین نہ سمجھا جائے؟ ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں تفسیر کا انتساب آنخضور ﷺ کی طرف فلاں فلاں وجوہ سے صحیح نہیں۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آنخضرت مفسر قرآن نہ تھے (نعوذ باللہ من ذالک) جس کے سپرد تعلیم کتاب اور تبیین کتاب کا کام کیا گیا ہو اُس سے بڑا مفسر قرآن اور کون ہو سکتا ہے؟ پس آنخضرت ہی کی تبیین کو تسلیم کرنا عین فریضہ رسالت ہی کو تسلیم کرنا ہے۔

باطنیت

(پروفیسر یوسف سلیم چشتی)

گمراہی کے دروازوں میں سے سب سے زیادہ خطرناک اور مضرت رساں دروازہ جو باطنیہ نے کھولا وہ یہ تھا کہ ہر لفظ کے ایک ظاہری معنی ہوتے ہیں اور ایک حقیقی یا باطنی۔ اُنہوں نے الفاظ کے اس باطنی پہلو پر اس قدر زور دیا کہ ان کا اصلی نام اسمٰعیلیہ غیر معروف ہو گیا اور وہ باطنیہ کے نام سے مشہور ہو گئے۔ بہر کیف انہوں نے کہا کہ اسی طرح قرآن و حدیث کے الفاظ میں بھی دو دو معنی ہیں ایک ظاہری دوسرے باطنی اور ان کو آپس میں وہی نسبت ہے جو پوست (ظاہر) کو مغز سے ہے، جہلاء صرف ظواہر (ظاہری معنی) سے آگاہ ہیں۔ حقائق یا باطنی معانی کو صرف اہل اسرار جانتے ہیں جو شخص ظواہر میں گرفتار ہے وہ شریعت کی پابندیوں میں جکڑا ہوا ہے اور دین کی نہایت نیچی سطح پر ہے، جو شخص اہل باطن کی صحبت میں رہ کر حقائق سے آشنا ہو جاتا ہے وہ شریعت کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کی اس آیت کا یہی مفہوم ہے **ویضع عنهم اصرهم والاغلال التی کانت علیهم** (یعنی رسول اس بوجھ سے نجات دلاتا ہے جس کے تلے وہ عوام دبے ہوئے تھے اور وہ طوق اتارتا ہے جو اُن کی گردنوں میں پڑے ہوئے تھے (۷۔۱۵۷)

باطنیہ نے اپنی اس بنیادی تعلیم کو عوام کے سامنے صوفی بن کر پیش کیا۔ رفتہ رفتہ جاہل صوفیوں نے پہلے ظاہر اور باطن کی تفریق کا اصول اختیار کیا پھر اس کے منطقی نتیجے کو بھی قبول کر لیا یعنی انہوں نے شریعت اور طریقت میں تفریق کر دی اور کہنے لگے کہ شریعت کا حکم کچھ اور ہے طریقت کا حکم کچھ اور ہے۔ آخر کار انہوں نے باطنیہ کی اس تعلیم کو بھی تسلیم کر لیا کہ جب سالک کو معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ قید شریعت سے آزاد ہو جاتا ہے اور اپنے اس باطل عقیدے کی اس آیت سے استدلال کیا **واعبد ربك حتی یاتیك الیقین** اور اس کا ترجمہ اس طرح کیا صرف اس وقت تک اپنے رب کی عبادت کر جب تک تجھے یقین حاصل نہ ہو جب معرفت یا یقین حاصل ہو جائے تو اتباع شریعت کی حاجت نہیں ہے۔

باطنیہ نے اس طرح لاکھوں مسلمانوں کو گمراہ کر دیا۔ عوام کے پاس کوئی آلہ یا معیار نہ

وقت تک تھا نہ اب ہے نہ آئندہ کبھی ہوگا جس کی مدد سے وہ یہ معلوم کر سکتے کہ یہ شخص جو ظاہر میں صوفیوں کا لباس پہنے ہوئے بیٹھا، تصوف کے اسرار و رموز بیان کر رہا ہے باطن میں کیا ہے؟' اگر کسی عامی نے اعتراض بھی کیا کہ یہ قول قرآن یا حدیث کے خلاف ہے تو معتقدین نے اسے گستاخ قرار دے کر مجلس سے باہر نکال دیا۔ قصہ ختم شد۔

میں نے یہ صراحت اس لئے کی کہ آج بیسویں صدی میں بھی سنی عوام کے دلوں میں جو یہ تفریق جاگزین ہے اور وہ اپنے ''بزرگوں'' کی خلافِ شرع باتوں پر اعتراض نہیں کرتے بلکہ ان کو از قبیل رموز و اسرار طریقت سمجھتے ہیں، یہ تفریق عبداللہ بن سباء کے متبعین کی پیدا کردہ ہے اور بیس سال کے مطالعہ کے بعد میرا پختہ عقیدہ یہ ہے کہ سبائیت اور اس کی نکھری ہوئی صورت یعنی باطنیت دراصل نبوت و رسالتِ محمدیؐ کے خلاف ایک بغاوت یا باغیانہ تحریک تھی۔ یعنی ولایت کے پردے میں نبوت کی تحقیر و تذلیل، ثبوت ملاحظہ ہو:۔

اقتباس از ولایت نامہ تالیف سلطان العارفین و برہان الواصلین مولا الشہید الحاج ملا سلطان محمد گنابادی، سلطان علی شاہ چاپ دوم، چاپخانہ دانش گاہ تہران ۱۳۸۵ قمری صفحہ ۳۵)

قبول رسالت بیعت کردن است برقبولِ احکام ظاہری وقبول ولایت بیعت کردن است برقبول احکام باطنی۔ اول را اسلام وثانی را ایمان می گویند وچوں قبولِ رسالت بجہت وصول بسوئے ولایت است کہ فرمود ولکن

اللہ یمن علیکم ان ھداکم للایمان (۴۹۔۱۷)

وفرمو وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ

(۵۔۱۶۷) یعنی رسالت تو مقدمہ ولایت علی علیہ السلام است اگر تبلیغ ولایت نہ کردی وبیعت بولایت علی مگرفتی ہیچ تبلیغ رسالت نہ کردہ کہ مقدمہ بدون ذی مقدمہ وجودش باعدم مساوی است وبلاحظہ حیثیت رسالت وولایت نسبت بحدیث دادہ شد کہ **لولا علی لما خلقتك** (انتھی بلفظہ)

میں نے یہ زحمتِ نقل اس لئے گوارہ کی ہے کہ اگر میں اس عبارت کا اردو ترجمہ درج کر دیتا تو بعض قارئین ضرور دل میں کہتے کہ مصنف نے یہ باتیں نہیں لکھی ہونگی مترجم سے ترجمہ کرنے

لیکن اِن لوگوں کی خاطر جو عربی اور فارسی ... اس کی رسائی نہ ہو سکی۔ ... مفہوم تک

میں غلطی ہو گئی یا مفہوم تک اِس کی رسائی نہ ہو سکی۔

جانتے اس کا مطلب ذیل میں درج کیے دیتا ہوں۔

۱۔ مصنف کی نقل کردہ پہلی آیت قرآن مجید میں یوں ہے **بل اللہ یمن علیکم ان ھداکم للایمان** ۔یعنی بلکہ اللہ احسان رکھتا ہے اوپر تمہارے یہ کہ ہدایت کی ... طرف ایمان کے (۴۹۔۱۷)۔

۲۔ قبول رسالت کا معنی ہے بیعت کرنا۔ احکام ظاہری کے قبول کرنے پر۔

۳۔ قبولِ ولایت کا معنی ہے بیعت کرنا، احکام باطنی کے قبول کرنے پر (یعنی رسالت کا ... احکام ظاہری سے ہے اور ولایت کا تعلق احکام باطنی سے ہے۔ یعنی احکام ظاہری اور باطنی ... تفریق جس سے شریعت اور طریقت میں تفریق پیدا ہو گئی اور اُمت میں تفرقہ رونما ہو گیا۔

۴۔ رسالت محمدی کو قبول کرنا اسلام ہے۔ ولایت علی کو قبول کرنا ایمان ہے۔

۵۔ اے رسول اگر تو نے ایسا نہ کیا، پس نہ پہنچایا تو نے پیغام اُس (اللہ) کا (۵۔۱۷)

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے محمد تیری رسالت، مقدمہ ہے، ولایت علی کا اگر تو نے ولایت کی ... نہ کی اور بیعت نہ لی تو رسالت کی تبلیغ بالکل نہیں کی۔ کیونکہ مقدمہ اگر ذی المقدمہ کے بغیر ہو تو ... کا وجود اور عدم دونوں مساوی ہیں۔

۶۔ رسالت اور ولایت کی حیثیت کو مدنظر رکھ کر اِس حدیث سے نسبت دی گئی کہ ... (پیدا) نہ ہوتا تو اے محمد میں تجھے (بھی) پیدا نہ کرتا۔

اس عبارت پر راقم الحروف کو یارائے تبصرہ ہے نہ حوصلہ تنقید صرف دو تین باتوں ... کرتا ہے۔

(الف) اس عبارت سے ثابت ہوا کہ ولایت، نبوت سے افضل ہوتی ہے کیونکہ ... بہرحال افضل ہے اسلام سے۔

(ب) جب تک ایک شخص ولایت علیؑ پر ایمان نہ لائے، مومن نہیں ہو سکتا۔

(ج) رسالت محمدی کی بذات خویش کوئی قدر و قیمت نہیں ہے اور نہ مقصود بالذات ... محض مقدمہ ہے ولایت علی کا اور اس لئے منطقی طور پر مقصود بالعرض ہے۔

(د) رسالت ذریعہ یا واسطہ ہے حصول مقصد کا اور وہ مقصد ہے "گرفتن بیعت ولایت علیؑ"
اور یہ بات محتاج ثبوت نہیں ہے کہ ذی واسطہ یا مقصد، واسطے یا وسیلے سے افضل ہوتا ہے اس لئے ولایت افضل ہے، رسالت سے۔ یعنی صاحب ولایت افضل ہے، رسالت سے یعنی صاحب ولایت افضل ہے صاحب رسالت سے بالفاظ واضح تر حضرت علیؑ افضل ہیں حضرت رسول اللہؐ سے۔

(ہ) قرآن سے تو یہ معلوم ہے کہ بعثت رسول کا مقصد یہ ہے کہ وہ دین الحق (اسلام) کو تمام ادیان عالم پر غالب کردے۔ **کما قال اللہ عزوجل ھوالذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ** اللہ وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ساتھ ہدایت اور دین حق کے تا کہ وہ اس کو غالب کردے سب دینوں پر۔

لیکن سلطان العارفین فرماتے ہیں کہ اللہ نے رسول کو اس لئے بھیجا کہ وہ حضرت علیؑ کی ولایت پر لوگوں سے بیعت لے اور اگر وہ ایسا نہ کریگا تو اس کا وجود اور عدم دونوں برابر ہو جائیں گے۔

یہ وہ نکتہ ہے جس میں فہم سرگردان ہے اور عقل حیران ہے۔

اگر اس جگہ یہ اعتراض کیا جائے کہ **بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ان لم تفعل فما بلغت رسالتہ** کا ترجمہ تو یہ ہوگا کہ اے رسول پہنچادے (لوگوں کو) جو کچھ اتارا گیا ہے تیری طرف تیرے رب کی طرف سے اور اگر ایسا نہ کیا تو نے تو نہ پہنچایا پیغام اس کا" اب نہ تو ان دونوں جملوں میں حضرت علیؑ کا اسم گرامی آیا ہے اور نہ سارے قرآن میں کہیں ان کا نام آیا ہے۔ نہ ان آیتوں سے پہلے ان کا تذکرہ ہے۔ اور نہ ان کے بعد ان کا تذکرہ ہے۔ پس اندریں صورت ان دو آیتوں سے حضرت علیؑ کا تعلق کیسے ثابت ہو سکتا ہے۔ تبلیغ کا مطلب تبلیغ ولایت و بیعت گرفتن ولایت علیؑ کیسے ہو سکتا ہے **مآ انزل الیك** کا مصداق تو قرآن ہے کیونکہ وہی آنحضرت پر بواسطہ جبریل نازل ہوتا رہا تو مطلب یہ ہوا۔

کہ قرآن (لوگوں) کو پہنچا اور اسی قرآن کی طرف لوگوں کو دعوت دے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تو ظاہری معنی ہیں۔ لیکن سلطان العارفین نے اس کے باطنی معنی

بیان کئے ہیں جو صرف اہل اسرار پر منکشف ... تک رسائی اس ...

تک نہیں ہو سکتی۔

باطنی معنی نکالنے کے لئے قران کے ظاہری الفاظ کی تاویل اس طریقے اور اس انداز سے کی ... کہ صرف، نحو، معانی، بیان، عقل اور خرد سب کا خاتمہ ہو جائے اور پڑھنے والا وادی حیرت میں گم ہو جائے۔ باطنیہ کا سب سے بڑا احسان ہے اُمّت محمدیؐ پر۔ جس کا اندازہ یہ اُمّت ابھی تک نہیں لگا سکی ہے۔ یہ فتنہ رومی کے زمانے میں اپنے شباب کو پہنچ چکا تھا۔ اس لئے انہوں نے مسلمانوں کو اس طرح متنبہ کیا ہے۔

می کنی تاویل حرفِ بکررا خویش را تاویل کن نے ذکررا

میرا خیال ہے کہ آیت زیر بحث کے جو معنی برہان الواصلین نے بیان کئے ہیں۔ وہ رسول ... کیا خدا کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آئے ہوں گے۔ شاید اقبال نے اسی قسم کی تاویلات باطلہ کے نمونے دیکھ کر یہ قطعہ کہا ہو گا۔

زمن بر صوفی وملا سلامے که پغیام خدا گفتند مارا

دلے تاویلِ شاں درحیر انداخت خدا و جبریل و مُصطفٰے را!

باطنیہ کی اسی تدسیس کی بدولت صحیح اسلامی قرآنی تصوف کی ساتویں صدی ہجری میں ... قلب ماہیت ہو چکی تھی کہ تصوف اور تشیّع مترادف الفاظ بن گئے تھے۔ چنانچہ حیدر علی آملی ... تفسیر بحرالابحار نے لکھا ہے۔

تصوف طریقہ مرتضوی است و تصوف اور تشیّع یک معنی دارد (ماخوذ از اصول تصوف ... ڈاکٹر احسان اللہ استخری ص ۲۰)

یہی موئف ولایت کی بحث میں لکھتا ہے:۔

ولایت از آنِ خدا است و برآں ایں آیت شاہد است **ھنالک الولایۃ لله الحق ۵۸۔۴۴**) از خدا بمُصطفٰے و دراین حقیقت جامعیت است، علی و فاطمہ تا حضرت ثانی عشر، یک پایہ و دارائے یک ناپایہ اند چنانچہ رسول فرمود (ا) **اول ماخلق الله** نوری (ب) **انا و علی من نور واحد** (شاعرے ایں حدیث را چنیں ...

است)اصول تصوف مؤلفہ ڈاکٹر احسان اللہ استخری صفحہ ۶۹)

علی و مصطفٰے ہمچو دو دیدہ
زیک نور جلیل اند آفریدہ

مقصود ان تصریحات سے یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں نقشبندی سلسلے کے علاوہ جس قدر سلسلے سنیوں میں پائے جاتے ہیں۔ سب میں کم وبیش یہی عقائد مسلم اور مقبول ہیں۔ سنی عوام کا تو ذکر ہی کیا ہے خواص بھی حضرت علیؓ کے بارے میں یہی عقائد رکھتے ہیں۔ بلکہ بوقت حاجت رسول کے بجائے انہی کو پکارتے ہیں اور کیوں نہ پکاریں جب وہ اپنے بزرگان سلسلہ کی تصانیف میں یہ پڑھتے رہتے ہوں کہ جنگ تبوک میں خود آنحضرتؐ نے ''مولا علی'' کو پکارا تھا۔

اسی لئے عصر حاضر کے مصری محقق ڈاکٹر زکی مبارک کو یہ کہنے کا موقع مل سکا۔

والواقع ان الصلة بين التشيع والتصوف فعلي هو معبود الشيعة وامام الصوفيهo۔ التصوف الاسلامی مولفہ ڈاکٹر زکی مبارک جلد دوم صفحہ ۲۳)

مزعومہ کا یہی تذکرہ نہیں ہے۔ اللہ کو معلوم تھا کہ سبائی حضرت علیؓ سے ولایت کو منسوب کر کے انہیں رسول سے بڑھا دیں گے۔ اِس لئے اللہ نے دو جگہ لفظ **ولایة** تو استعمال کیا ہے (دیکھو ۸:۷۲ **مالكم ولا يتهم من شي** ۔ الخ) مگر لفظ ولایۃ کہیں استعمال نہیں کیا قرآن میں نہ کہیں لفظ علی (اسم زوج فاطمہ) آیا ہے نہ لفظ ولایت آیا ہے اور نہ ولایت علی کا کوئی تذکرہ ہے ہر مومن متقی اللہ کا ولی (دوست) ہے اور اللہ اِس کا ولی (دوست) ہے۔ باز آمدم بر سر مطلب آیت زیر بحث سے پہلے اللہ نے دو آدمیوں کی مثال بغرض تذکیر بیان کی ہے جن میں سے ایک کو اللہ نے باغ اور دولت دی جس پر اِس نے تکبر کیا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے اِسے ان نعمتوں سے محروم کر دیا اِس نے کہا **یالیتنی لم أشرك بربی احدا** پھر آگے آیت میں اللہ فرماتا ہے کہ کوئی جماعت اِسے مدد نہ دے سکی اور نہ وہ خود بدلہ لے سکا۔ اِس کے بعد یہ آیت ہے کہ **هنالك الولاية لله الحق** یعنی حقیقت یہ ہے کہ حکمرانی، کارسازی اور نصرت یہ ساری باتیں صرف اللہ کیلئے ثابت ہیں جو الحق یعنی سچا اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

اب قارئین خود ہی فیصلہ کرلیں کہ اِس آیت کو سبائیوں کی موہومہ ولایت سے کیا تعلق ہے

لیکن اس فرقے نے باطنی مفہوم متخرج کرنے کیلئے پہلے تاویل کا دروازہ کھولا۔ پھر تاویل کے ذریعے سے پورے قرآن کو بازیچہ اطفال بنادیا۔ اس کی مثالیں سبائیہ باطنیہ قرامطہ کے لٹریچر سے بآسانی مل سکتی ہیں۔ تفصیل کے لئے دیکھو قواعد آل محمد (باطنیہ) تالیف محمد بن حسن الدیلمی یمانی زمانہ تصنیف ۷۰۷ھ صفحہ ۱۷، ۱۸ مثلاً طہارۃ سے مراد ہے مذہب باطنی کے علاوہ ہر مذہب سے براءۃ زنا سے مراد ہے علم باطن کے نطفے کو کسی ایسی ہستی کی طرف منتقل کرنا جو عہد میں شریک نہ ہو۔ روزے سے مراد ہے افشائے راز سے پرہیز کرنا۔ نماز سے مراد امام وقت کی طرف لوگوں کو دعوت دینا۔ تیمم سے مراد ہے ماذون سے علم حاصل کرنا، حج سے مراد ہے اس علم کا طلب کرنا جو منزل مقصود ہے۔ زکوٰۃ سے مراد ہے اہل استعداد میں اشاعت علم کرنا۔

(منقول از تاریخ دعوت وعزیمت مولفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی صفحہ ۱۰۸)

قرآن مجید فہم و تدبر سے پڑھنے کی اہمیت

(ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ)

قوموں کے عروج و زوال کا معیار

اب ایک دوسرا غور طلب قاعدہ بیان کرتا چلوں جسے میرے آقا ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے۔
عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔

اِن اللّٰہ یرفع بھذا الکتاب اقوامًا و یضع بہ آخرین ٥

''بے شک اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے سے بعض قوموں کو رفعت و بلندی عطا فرما دیتے ہیں اور اسی کتاب کو چھوڑ دینے کی وجہ سے بعض قوموں کو نیچے گرا دیتے ہیں''۔ (مسلم)

یعنی پیمانہ اِس کتاب کو بنایا گیا ہے جو بھی اِس کتاب کے جتنا قریب ہوگا، اتنا ہی بلند ہوتا چلا جائے گا اور جو اُس کتاب سے جتنا دور ہوگا اتنا ہی نیچے گرتا چلا جائے گا۔ یہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی ایک سنت اور ہمارے لئے ایک مستقل راستہ بتا دیا ہے۔ اب پورے عالم اسلام پر نظر ڈالئے۔ قرآنِ پاک کو سمجھ کر پڑھنے والے کتنے لوگ ہیں؟ کتنے لوگ ہیں جنہوں نے زندگی میں ایک مرتبہ بھی پورا قرآن سمجھ کر پڑھ لیا ہے۔

مولانا مفتی محمد شفیعؒ سے ایک دفعہ بات ہوئی۔ عرض کیا قرآن مجید کو کتنا پڑھنا چاہیے؟ کہنے لگے ''بھئی احادیث کا مطالعہ کر کے دیکھو، کوئی صحابی تمہیں ایسا نظر آتا ہے جو قرآن مجید کو ختم کرنے میں سات دن سے زیادہ صرف کرتا ہو؟ اسی لئے قرآن مجید کی سات منزلیں بنائی گئی ہیں تاکہ قرآن مجید سات دنوں میں ختم ہو جائے۔

تلاوتِ قرآن کے بارے میں ایک بہت عظیم الشان اور مشہور حدیث ہے۔
حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔
''جس نے اللہ کی کتاب سے ایک لفظ پڑھا، اُس کے لئے ایک نیکی ہے، اور ایسی نیکی کہ جس کا درجہ دس کے برابر ہے۔ یعنی ایک حرف پر دس نیکیاں اور میں یہ نہیں کہتا کہ الم ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے، لام دوسرا حرف جبکہ میم تیسرا حرف ہے۔ (ترمذی)
یہ لفظ ادا کیا تو تیس نیکیاں مل گئیں۔ اب اسی حدیث کا مطالعہ دیگر احادیث سے ملا کر کیا،

جائے تو معلوم ہوگا کہ اگر یہی تلاوت وضو کر کے کی جائے تو دس کی بجائے تیس نیکیاں ملیں گی
اگر یہی تلاوت نماز کے اندر کی گئی تو ہر حرف پر پچیس کی بجائے پچاس نیکیاں ملیں گی۔

عن ابی ذر قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یا ابا ذر لئن تغدوا تتعلم اية من القران خیرلك من ان تصلی مائة ركعة

ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ "اے ابو ذر! تو اگر صبح اُٹھتے ہی قرآن مجید کی ایک آیت سیکھ لے (اسے با ترجمہ پڑھ کر اس کا مفہوم جان لے) تو وہ تیرے لئے سو رکعت نوافل پڑھنے سے زیادہ بہتر ہے"۔ (ابوداؤد)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے ایک مجلس میں بہت سی نصیحتیں فرمائیں، ان میں سے ایک نصیحت یہ بھی تھی کہ۔

"کسی حال میں بھی قرآن کی تلاوت نہ چھوڑنا"۔

یہاں ایک اہم بات عرض کرتا چلوں کہ میں یہاں تلاوت وقرات کی بات کر رہا ہوں تفسیر کی بات نہیں کر رہا۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے تلاوت قرآن کا کام کثرت سے کیا ہے۔ جبکہ تفسیر کا کام تو بہت کم صحابہ کرامؓ نے کیا ہے۔ ایک صحابی بھی ایسا نہیں جو روزانہ قرآن کو سمجھ کے نہ پڑھتا ہو اور ہفتے میں ایک مرتبہ قرآنِ مجید ختم نہ کر لیتا ہو اور تلاوت ہماری یہاں کے حفاظ کی طرح جلدی جلدی نہیں کی جاتی تھی بلکہ ترتیل سے ہوتی تھی۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًاؕ (مزمل۔4)

"قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھو (اس طرح کہ ایک ایک حرف الگ الگ ہو)"

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اگر اِس سے بڑا کوئی اور عمل ہوتا تو محمد رسول اللہ ﷺ ضرور اختیار فرماتے اور صحابہ کرامؓ کو بھی اُسی پر مامور فرماتے۔ لیکن آپؐ نے زندگی بھر یہی کام کیا نے زیادہ سے زیادہ تلاوت قرآن کا عمل اختیار کیا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

یایها المزمل ٥ قم الیل الا قلیلا ٥ نصفه اوانقص منه قلیلا ٥ ورتل القراٰن ترتیلا ٥

"اے اوڑھنے والے! رات کو قیام کیجئے۔ آدھی رات یا اس سے کچھ کم یا اس سے کچھ زیادہ اور اس قیام کے دوران میں قرآن مجید کو ٹھہر ٹھہر کے پیار اور محبت سے اور فکر و تدبر سے پڑھئے"۔

حضورؐ نے زندگی بھر صرف یہی کام کیا۔ آپؐ کے مختلف مواقع پر کئے جانے والے وظائف اپنی جگہ لیکن مستقل اور ہمیشہ کا وظیفہ قرآن مجید تھا۔ اس کو ٹھہر ٹھہر کے آرام اور توجہ سے دل لگا کر پڑھنا، ایک ایک حرف، ایک ایک آیت اور ایک ایک لفظ کو اپنے دل کے اندر اُتار کے پڑھنا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زندگی بھر یہی معمول رہا اور یہی معمول صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کا تھا۔

صحابہ کرامؓ کی روحانیت

صحابہ کرام کی روحانیت تین کاموں پر مبنی تھی۔ نماز، تلاوت اور جہاد۔ باقی سب کام بھی ساتھ ساتھ چلتے لیکن ان کا درجہ ثانوی ہو جاتا۔ فرض نماز کو باجماعت ادا کرنے پر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے جس قدر زور دیا ہے، اس سے زیادہ کسی بات پر زور نہیں دیو۔ اس کے بعد کثرتِ تلاوت میں تمام صحابہ ایک دوسرے سے سبقت فرماتے۔ اُن کی تلاوت یہ بھی کہ تدبر اور تذکر کے ساتھ پڑھتے تھے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

کتب انزلنه الیك مبرك لیدبرو ایته ولیتذکر اولوالالباب ٥

"یہ کتاب جو ہم نے تم پر نازل کی ہے بابرکت ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں اور عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں (اس کے مطابق زندگی گزاریں)" (ص:29)

جہاد کی ابتدا یہ ہے کہ آدمی دین سیکھنا اور سکھانا شروع کردے اور انتہا یہ ہے کہ اس کام میں جان قربان کردے۔ باقی درمیان کے سب درجے جہاد شمار ہوتے ہیں۔ مگر ہم نے ان تینوں کاموں کا یہ حشر کیا کہ ان کو چھوڑ دیا۔

نماز کے بارے میں حدیث شریف ہے:۔

"تمہاری نماز میں تمہارا حصہ وہی ہے جو تم نے سمجھ کر پڑھا"۔

یہ کوئی جنتر منتر تو ہے نہیں کہ اسے بغیر سوچے سمجھے پڑھ لیا۔ اس مرحلے سے ذرا آگے بڑھے تو یہ حال ہو گیا کہ فرض نماز آئی اور گزر گئی۔ آج کل بڑے بڑے بزرگ بھی یہی عمل کرتے نظر آتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نماز چھوٹ گئی۔ یہاں تک کہ اب ان میں سے بعض کو (نعوذ باللہ) نماز کی حاجت نہیں۔ سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کو زندگی کے آخری لمحے تک نماز کی حاجت رہی۔ مرض الموت تک مسجد میں اس طرح تشریف لاتے کہ دو صحابہ کرامؓ نے دائیں اور بائیں سے سہارا دے کر تقریباً اُٹھایا ہوا ہوتا اور آپ کا پاؤں زمین پر گھسٹتا ہوا چلتا اور گھر سے لے کر مسجد کی صف تک پاؤں کے انگوٹھے سے ایک لکیر سی کھنچ جاتی۔ غرضکہ آخری لمحہ تک نماز نہ چھوٹی۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین تلاوت کرتے ہوئے گھنٹوں تک روتے رہتے تھے اور انہیں تلاوت کرتے ہوئے وجد آ جایا کرتا تھا۔ امام ابو حنیفہؒ کا ذکر ہے کہ ایک دفعہ پوری رات ایک آیت کی تلاوت کرتے رہے اور روتے رہے۔ یہ سورۃ یٰسین کی آیت تھی۔

وامتازو الیوم ایھا المجرمون ۝

"اے مجرمو! آج تم علیحدہ ہو جاؤ"۔ (یٰسین: 59)

حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے ذوق کا یہ عالم تھا کہ انہیں وجد بھی قرآن مجید کی آیات پر آتا اور اُن کے آنسو قرآن کی آیات کی وجہ سے بہتے تھے ایک صحابیؓ سے حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے قرآن مجید سناؤ، اُنہوں نے تلاوتِ کی تو حضورِ اکرمؐ رونے لگے۔

حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے کیا خوب بات کہی:۔

صوفی پشمینہ پوش و حال مست
از شراب نغمہ قوال مست

ترجمہ: ہمارے ہاں کا صوفی جس نے پشمینہ پہن رکھا ہے، عجب حال میں مست ہو گیا ہے۔ اسے قرآن پہ وجد نہیں آتا لیکن جب قوال کو سنتا ہے تو اُسے وجد آنے لگتا ہے۔

آتش از شعرِ عراقی در دلش
در نمی سازد بقرآں محفلش

ترجمہ! عراقی کے شعر سے تو اُس کے سینے میں آگ بھڑک اُٹھتی ہے۔ اُس کی محفل میں اگر کوئی چیز جگہ نہیں پاتی تو وہ قرآن ہے۔

بایاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یٰسین او آساں بمیری

ترجمہ! قرآن کی آیات سے تمہیں بس اتنا کام رہ گیا ہے کہ سورۃ یٰسین پڑھو اور تمہیں مرنے میں آسانی ہو جائے۔

بغیر سمجھے تلاوتِ قرآن کی حیثیت

تلاوت قرآن کے نتیجہ میں ثواب سے متعلق جتنی احادیث ہیں، یہ اُس دور کی ہیں جب غیر عرب لوگ بھی دین اسلام کے دائرے میں داخل ہو رہے تھے۔ مثلاً حضرت سلمان فارسیؓ، عربی نہیں جانتے تھے۔ اُن سے کہا گیا کہ تلاوت نہ چھوڑو۔ ہاں، جب عربی زبان سیکھ جاؤ تو سمجھ کے پڑھ لینا۔ کچھ ایرانیوں نے اسلام قبول کیا۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ اُن کیلئے نماز کا ترجمہ فارسی میں کردو۔ یہ اِس لئے کہا گیا کہ وہ لوگ نماز کو پورے فہم کے ساتھ ادا کریں۔ اِس دوران میں انہیں اتنی عربی آ گئی کہ وہ نماز کو سمجھ کے ادا کرنے لگے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضورؐ نے انہیں فارسی میں نماز پڑھنے کی اجازت صرف قلیل مدت کے لئے مرحمت فرمائی تاکہ اتنے عرصہ میں یہ لوگ عربی میں شد بد حاصل کر کے عربی میں نماز پڑھنا سیکھ لیں۔ ایسے ہی وہ ساری احادیث ہیں جن میں فرمایا گیا کہ قرآنِ مجید کی تلاوت بغیر ترجمہ کے جائز ہے۔

سیدھی سی بات ہے قرآنِ مجید دنیا میں اِس لئے نازل کیا گیا کہ اِس کی تلاوت کی جائے۔ اِس کو سمجھا جائے اور اِس پر عمل کیا جائے، اگر عربی سے ناواقفیت خدانخواستہ سرے سے ترک قرآن کا سبب بننے لگے تو ایسی صورت میں اجازت دے دی جاتی ہے کہ جب تک عربی زبان نہیں آتی اس وقت تک کے لئے قرآن کو بالکل نہ چھوڑو، بلکہ جیسے بن پڑتا ہے، بلاترجمہ تلاوت کرتے جاؤ، پھر بھی اجر ملے گا۔ اگر عربی زبان کے ابجد سے بھی آگاہ نہیں تو فرمایا کہ عربی زبان اور اس کی ابجد کو جلد از جلد سیکھ لو لیکن اِس دوران میں بھی قرآن مجید فرقان حمید سے کنارہ کشی اختیار نہیں کرنا۔ قرآن کو اُٹھا کر حسرت کی نگاہوں سے صفحہ بہ صفحہ اُلٹ پلٹ کے دیکھتے رہنا۔

ارشادِ رسول اکرم ﷺ ہے:۔

''قرآن پر نظر ڈالنا بھی عبادت ہے''۔

لوگوں نے زندگی بھر کا یہ وطیرہ بنالیا کہ صبح اُٹھے، قرآن کھولا اور ہر سطر پر انگلی پھیرتے گئے اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتے گئے۔ قرآنِ مجید کو صرف حسرت بھری نظر سے دیکھتے رہنے یا بغیر سمجھے بھی تلاوت کرتے رہنے کی اجازت مرحمت فرمائی گئی۔ ورنہ فارسی یا کسی دیگر زبان میں نماز ادا کرنا جائز نہیں۔ نماز صرف عربی زبان میں ہوتی ہے۔ سورہ فاتحہ اور قرآن سب اسی (عربی) زبان میں پڑھا جائے گا۔ ہم نے زندگی بھر کا یہ وطیرہ بنالیا ہے کہ یا تو سطروں پر اُنگلیاں پھیرتے رہیں گے اور اگر تلاوت کریں گے بھی تو بغیر سمجھے۔ ذرا غور کیجئے یہ سلوک جو ہم نے قران مجید فرقان حمید کے ساتھ روا رکھا ہے اگر یہی سلوک ہم اپنے کسی محبوب کے خط کے ساتھ کریں۔ مثلاً آپ کے والد صاحب آپ کو تار دیں کہ بھئی مجھے اس تاریخ کو فلاں وقت لاہور ائیر پورٹ سے لے لینا۔ اب آپ اِس کاغذ پر خوشبو لگائیں، اِسے سبز غلاف میں لپیٹ کے رکھیں اور لے جاکر کسی انگریز کو دکھائیں کہ اِس کی تلاوت کر کے مجھے سناتے جاؤ، ترجمہ بتانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ایسی صورت میں والد صاحب بیچارے پہلے تو ائیر پورٹ پر انتظار کریں گے اور جب گھر پہنچیں گے تو خوب خبر لیں گے۔

ہمارے زوال کا سب سے بڑا سبب قرآنِ مجید سے لاتعلقی ہے اور قرآن سے لاتعلقی کو آخرت اور اِس دنیا کے اندر ذلت کا باعث فرمایا گیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وقال الرسول یرب ان قومی اتخذوا هذا القران مهجورا

''رسولِ اکرم (ﷺ) (قیامت کے دن) یوں کہیں گے، اے میرے پروردگار! میری قوم نے قرآن پاک کو چھوڑ دیا تھا۔ (الفرقان:30)

قرآن کو چھوڑ دینا یہ ہے کہ کبھی اِس کو ہاتھ ہی نہ لگایا جائے اور قرآن کو چھوڑ دینا یہ بھی ہے کہ کبھی اسکے مفہوم پر غور ہی نہ کیا جائے۔ اِس لئے راقم یہ فتویٰ دینے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا کہ جس شخص کے زندگی بھر کے پروگرام میں قرآن پاک باترجمہ پڑھنا شامل نہیں، وہ حقیقی معنوں

ہیں مسلمان نہیں اور وہ انہی لوگوں کی صف میں ہوگا جن کے متعلق قیامت کے روز یہ استغاثہ دائر ہوگا کہ۔

''یہی وہ میری قوم کے لوگ ہیں جنہوں نے قرآن پاک چھوڑ دیا تھا''۔

آپ اللہ کے ہاں اپنا جواب سوچ رکھئے حکیم الاُمت حضرت ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ، صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

تمہاری خواری اور ذِلت کا سبب قرآن کو چھوڑ دینا ہے۔علامہؒ فرماتے ہیں۔

خوار از مہجوری قرآں شدی
شکوہِ سنج گردش دوراں شدی

تو گردشِ دوراں کا شکوہ کرتا ہے اور مختلف اسباب کو اپنے زوال کا سبب بتاتا ہے۔ تو نادان ہے، دراصل صرف قرآن کو چھوڑنے کی وجہ سے تو خوار ہوا ہے''۔

سبب کچھ اور ہے جس کو تو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

یہی شکوہ قرآنِ مجید کے اندر اِن لوگوں کے بارے میں موجود ہے جو اِس دنیا میں ذِلت کا شکار ہو رہے ہیں۔ یہود کے بارے میں اور پھر مسلمانوں کے بارے میں بھی آگے چل کر یہی فرمایا کہ اِن اہل کتاب کا جرم یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا ہے۔

مثل الذین حملواالتورته ثم لم یحملوها کمثل الحمار یحمل اسفارًاo

''جن لوگوں پہ تورات (قبول کرنے، سمجھنے اور اِس پر عمل کرنے کی ذمہ داری) کا بوجھ ڈالا گیا پھر اُنہوں نے اِس (کے بارِ تعمیل) کو نہ اُٹھایا، اُن کی مثال گدھے کی سی ہے، جس پر بڑی بڑی کتابیں لدی ہوں''۔ (الجمعہ :5)

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینت والھدی من بعد ما بینه للناس فی الکتب اولئك یلعنهم الله و یلعنهم اللعنون ٥

''وہ لوگ جو ان حکموں اور ہدایتوں کو جو ہم نے نازل کی ہیں (کسی غرض سے) چھپاتے ہیں باوجود یکہ ہم اُن لوگوں کے (سمجھانے کے لئے) اپنی کتاب میں کھول کھول کر بیان کر دیا ہے۔ ایسوں پر اللہ اور تمام لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں''۔(البقرہ:159)

دیکھئے! یہ وہ کتاب ہے جس کو حق تعالیٰ شانہ نے واضح کر کے ہماری طرف نازل کیا۔ اگر ہم اس کو زمانے کے سامنے پیش نہ کریں اور خزانے کے سانپ بن کر اِس کے اوپر بیٹھ جائیں تو اس کے بارے میں یہ وعید آئی کہ اللہ ایسے لوگوں کے اُوپر لعنت بھیجتا ہے۔

امام مالکؒ نے ایک قاعدہ بیان کر دیا۔

''اِس اُمت کے آخری حصے کے لوگوں کی اصلاح بھی اِسی طرح ہوگی جس طرح پہلے لوگوں کی ہوئی تھی''۔

جس چیز سے صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کی اصلاح ہوئی اِسی چیز سے بعد والوں کی بھ اصلاح ہوگی۔ اگر پہلے والوں کی اصلاح قرآن سے ہوئی ہے تو آخر والوں کی اصلاح بھی قرآ مجید فرقان حمید ہی سے ہوگی۔ راقم جس چیز کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآ مجید سمجھنے کیلئے تھوڑی سے عربی زبان سیکھ لیں تا کہ آپ قرآنِ مجید کی تلاوت سمجھ کے کر سکیں ا آپ کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچے۔ جب تک پیغام نہیں پہنچے گا تب تک اِس پر عمل کی کوئی صورت مم نہیں اور پیغام اُسی وقت پہنچے گا جب وہ سمجھ میں آئے گا۔

ان قرآن الفجر کان مشھودا ٥

''(فجر کی نماز پر پکے رہنا) بے شک صبح کے وقت قرآن پڑھنا (ہمارے) مشاہدہ (کرم) کا باعث ہے''۔(بنی اسرائیل:78)

یہ قرآن ہی تو ہماری تمام بیماریوں کا علاج ہے۔ یہ اپنے بارے میں کہتا ہے۔ ''وہ سینوں جو کچھ بھی ہے سب کا علاج بھی ہے''۔

وننزل من القرآن ما ھو شفاء ورحمة للمومنین ٥

''اور ہم قرآن (کے ذریعے) سے وہ چیز نازل کرتے ہیں جو مومنوں کے لئے شفاء اور رحمت ہے''۔(بنی اسرائیل:82)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھاo

''قرآن میں یہ لوگ تدبر کیوں نہیں کرتے، کیا اِن لوگوں کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں''۔(محمد:24)

یوں محسوس ہوتا ہے کہ اِس بات کے مخالف ہم ہیں، جنہوں نے قرآن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ رکھا ہے کہ اسے تو صرف چہلم، سوئم یا پھر کسی کی موت کے وقت پڑھنا ہے۔ یعنی کوئی جان بہ لب ہے تو سورہ یٰسین پڑھ ڈالو۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے۔

انسان کے دل پر بھی زنگ لگ جاتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح لوہے پہ پانی پڑنے سے زنگ لگتا ہے۔ عرض کیا۔ یارسول اللہ ﷺ پھر یہ زنگ کیسے دور کیا جا سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ دو چیزوں سے، ایک موت کا ذکر کثرت سے کیا کرو اور دوسرے قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہو۔

قرآنِ مجید اپنے بارے میں ایک دعویٰ کرتا ہے اس کے بارے میں ذرا غور کیجئے۔

الر کتب انزلنه الیك لتخرج الناس من الظلمت الی النورo

''(یہ) ایک (پرنور) کتاب (ہے) اس کو ہم نے تم پر اس لئے نازل کیا ہے کہ لوگوں کو اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاؤ''۔(ابراہیم:1)

اور آج اگر آپ اندھیروں سے نکل کر روشنی میں آنا چاہتے ہیں تو پھر اتنی عربی تو سیکھ لیں کہ قرآن سمجھ میں آنے لگے اور پھر کثرت سے اس کی تلاوت شروع کر دیں تو ظلمت کے اندھیرے چھٹ جائیں گے۔

ہماری مثال تو ایسے لوگوں کی سی ہے جو کسی دور دراز سرحدی چوکی پر محافظ کے طور پر متعین ہوں اور اپنی ڈیوٹی سے غیر حاضر ہو جائیں۔ چند چور ڈاکو بہروپیئے پولیس کی وردی میں وہاں پر

چارج سنبھال لیں اور ملی بھگت سے وہاں چوری اور ڈاکے کی کھلی اجازت دے دیں اور ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ شریف آدمی کا جینا ہی دوبھر ہو جائے۔ غور کیجئے کہ اِس لاقانونیت کا ذمہ دار کون ہوگا؟ آپ چوکی سے غیر حاضر ہونے والے عملہ ہی کو اِس ساری صورت حال کا ذمہ دار قرار دیں گے۔

دوستو! یہ آپ کی اور ہم سب کی ذمہ داری تھی کہ اتنی عربی پڑھ لیتے کہ قرآن مجید کو سمجھنے کے قابل ہو جاتے۔ یہ منبر و محراب ہی تو ہماری چوکیاں ہیں۔ ہم لوگ اپنی جگہ سے غیر حاضر ہیں۔ اس کی جواب طلبی ہم سے ہوگی۔ ہم نے قرآن نہیں پڑھا، ہم کلام پاک کے ترجمے سے دور ہیں حالانکہ اِس امر کیلئے یہ شرط قطعاً ضروری نہیں کہ پہلے پورا قرآن پڑھیں، عالم دین بنیں اور پھر تبلیغ دین کے کام کا آغاز کریں۔

حضورِ اکرم ﷺ کا ارشاد پاک ہے۔

بلغوا عنی ولو آیة

"اگر صرف ایک آیت تمہیں آتی ہے تو اُسے بھی آگے پہنچاؤ"۔ (ترمذی)

آپ قرآنِ مجید فرقانِ حمید کو سیکھنے کیلئے وقت نکالئے ورنہ اپنے اندر نبی کریم ﷺ کا درج ذیل استغاثہ پڑھنے کا حوصلہ پیدا کیجئے۔

وقال الرسول یرب ان قومی اتخدوا هذا القراٰن مهجوراً ٥

"اے پروردگار! یہ ہے میری قوم جس نے قرآن پڑھنا ترک کر دیا تھا"۔

مجھے یقین ہے کہ دین اسلام کسی سیاسی رستے سے نہیں آئے گا۔ مجھے اِس بات کا بھی یقین ہے کہ کسی مارشل لاء یا کسی ڈکٹیٹر شپ یا کسی اور ذریعے سے دین کا نفاذ ناممکن ہوگا۔ دین سے حکومت آیا کرتی ہے، حکومت کے ذریعے دین کبھی نافذ ہوتے نہیں دیکھا گیا اور دین قرآن کے علاوہ کسی اور رستے سے نہیں آئے گا۔ ہم صرف اور صرف قرآن ہی کے ذریعے سے مسلمان بنیں گے اور اللہ سے جو قرب کا ذریعہ قرآن ہے اور کوئی نہیں۔

تاریخ کے اوراق میں شہزادی زیب النساء کا ذکر ملتا ہے جو اورنگزیب کی عزیزہ تھی۔ اچھی شاعرہ تھی۔ شاعر اور ناقدین ایک دن اِس بات پر بضد ہو گئے کہ ملکہ کی زیارت کریں گے۔ ...

چونکہ پردہ دار خاتون تھیں انہوں نے اس خواہش کے جواب میں ایک شعر لکھ کر بھیج دیا۔

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

یعنی میں اپنے کلام میں یوں چھپی ہوئی ہوں جیسے پھول کی پتیوں میں خوشبو چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ جو مجھ سے ملنا چاہتا ہے وہ میرے کلام کا مطالعہ کر لے۔ یہ شعر جب طالبانِ دید نے پڑھ تو ان پر سکتہ طاری ہو گیا۔ انہوں نے کہا کہ ملکہ نے آج ہمیں اہم نکتہ سمجھا دیا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ بھی پردہ نشین ہیں، وہ بھی تو یہی فرماتے ہیں "میرے قریب آنا چاہتے ہو تو مجھے میرے کلام میں ڈھونڈ لو"۔

حضرت علامہ اقبالؒ نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے مخاطب ہوتے ہوئے بار بار یہی کہا ہے کہ "اگر میرا ایک شعر بھی کلام اللہ سے ہٹا ہوا ہو تو مجھے قیامت کے روز ذلیل و رسوا کر دیجئے گا اور مجھے اپنے پاؤں کے بوسوں سے محروم کر دیجئے گا۔

نیز فرمایا۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

اگر تمہاری خواہش ہے کہ قرآن کے بغیر زندہ رہو تو یہ بالکل ناممکن امر ہے۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر ست
ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است

یعنی میرے سینے میں ایک راز ہے جو آج فاش کر دیتا ہوں اور وہ یہ کہ قرآن فقط ایک کتاب ہی نہیں بلکہ کوئی اور چیز بھی ہے اور یہ وہ چیز ہے کہ۔

چوں بجاں در اوست جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد، جہاں دیگر شود

یہ کتاب جب جان کے اندر چلی جاتی ہے تو پھر جان کوئی اور چیز بن جاتی ہے اور جب جان بدل کر اس کتاب کے رنگ میں ڈھل جاتی ہے تو پھر اس کی پوری دنیا ہی بدل جاتی ہے۔

سلطان ٹیپو شہید ، جرات و شجاعت

(ارشاد احمد ارشد)

مسلم ہندوستان کی تاریخ گونا گوں اوصاف کی حامل شخصیات اور عجب قسم کے تضادات سے بھری پڑی ہے تاریخ کے ان اوراق میں مسلمانوں کیلئے راحت بھی ہے اور اذیت بھی، ظلم و جبر کی مثالیں ہیں تو عدل و انصاف کے پیکر بھی، بزدلی و کم ہمتی کی داستانیں ہیں تو جرات و شجاعت کے لازوال باب بھی، جفا کی کہانیاں ہیں تو صدق و وفا کے خوش کن تذکرے و ولولے بھی، محبت و مروت کے پھول ہیں تو شقاوت و عداوت کے کانٹے بھی۔ الغرض اِس تاریخ میں اسلام سے بیزار ملک وملت کے غدار حکمرانوں کے ناگفتہ بہ حالات ہیں تو اِس کے ساتھ اسلام کے جانثار و فادار اور اتحاد ملت اسلامیہ کے داعی و علمبردار حکمرانوں کے ایمان افروز واقعات بھی ہیں۔

برصغیر میں جرات و بہادری، شجاعت و دلیری اور صدق و وفا کا ہمیشہ زندہ رہنے والا باب مرد مومن سلطان ٹیپو شہید ہیں کہ جن کی جرات مندانہ اور ادائے دلبرانہ آنے والی نسلوں کے لئے ضرب المثل بن گئی۔

برصغیر کے بیشتر حکمرانوں کو صرف اِس لئے مسلمان کہا جاتا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے گھروں میں جنم لیا تھا۔ اِس کے علاوہ اِن حکمرانوں میں مسلمانوں والی کوئی خوبی نہیں پائی جاتی تھی۔ ان حکمرانوں میں سے سلطان ٹیپو کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ شعوری مسلمان حکمران تھے۔ بحیثیت عام مسلمان اور بحیثیت حکمران کے اسلام اپنے پیروکاروں سے جو تقاضے کرتا ہے سلطان ٹیپو شہید اِن تمام تقاضوں سے بخوبی آگاہ و آشنا تھے۔

سلطان 1750ء کو "دیون ہلی" کے مقام پر پیدا ہوئے۔ اِن کا سلسلہ نسب عرب کی قریش مکہ سے ملتا ہے۔ ان کے والد حیدر علی ناخواندہ لیکن غیر معمولی ذہن کے مالک تھے۔ وہ ایک معمولی عہدیدار سے ترقی کرتے کرتے ایک ریاست کے حکمران بن گئے۔ لیکن ان تمام صلاحیتوں کے باوجود وہ اپنی تعلیمی کمی کو شدت سے محسوس کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے کیلئے اعلیٰ تعلیم کا بندوبست کیا

سلطان ٹیپو کو سب سے پہلے اسلامی تعلیم سے آراستہ کیا گیا۔ اس کے بعد اِن کو اس وقت مروجہ اور عسکری تعلیم دی گئی۔ علاقائی زبانوں کے علاوہ انگریزی فرانسیسی، مرہٹی، فارسی، ... اردو اور عربی زبانیں بھی انہیں سکھائی گئیں۔ اس اعتبار سے اگر یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا

سلطان ٹیپو برصغیر کے تمام مسلمان حکمرانوں سے زیادہ تعلیم یافتہ تھے۔

1761ء میں جب حیدر علی نے میسور کی فوج کی کمان سنبھالی تو اس سے پہلے ہی برصغیر میں انگریز مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا خطرہ بن چکے تھے۔ چنانچہ حیدر علی کی پوری زندگی انگریزوں کے ساتھ نبرد آزمائی میں گزر گئی۔ سلطان ٹیپو نے 15 سال کی عمر میں پہلی مرتبہ اپنے والد کے ہمراہ کرناٹک کے میدان میں انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تو اس کے بعد وہ زندگی کے آخری سانس تک انگریزوں کے خلاف برسرِ پیکار رہے۔ نواب سراج الدولہ کے بعد حیدر علی اور سلطان ٹیپو ہی تھے جنہوں نے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے خطرے کی حقیقی نوعیت کو محسوس کیا اور اس خطرے کی سرکوبی کی اہمیت وضرورت کو سمجھا۔ علامہ اقبال مرحوم نے سلطان ٹیپو کی ساری زندگی کی جدوجہد کو ایک نہایت ہی خوبصورت اور بہت ہی مختصر فقرے میں سموتے ہوئے کہا تھا تب سلطان ٹیپو جاگ رہے تھے۔

بہادر باپ کے انتقال کے بعد بہادر بیٹے ٹیپو نے 1782ء میں سلطنت خداداد میسور کی قیادت سنبھالی۔ اپنی رعایا کی خدمت اور انگریزوں کے خلاف جہاد میں یہ دونوں چیزیں سلطان کو اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ سلطان کا ہر منصوبہ، ہر اتحاد، ہر معرکہ، اپنے دین، اپنے وطن اپنی ملت کے مفاد کے تابع اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرکوبی کیلئے ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انگریز سراج الدولہ کے بعد سلطنت میسور کو اپنے لئے شدید خطرہ سمجھتے تھے۔

سلطان ٹیپو کی زندگی پر دین اسلام کی گہری چھاپ تھی وہ نماز پنجگانہ باقاعدگی سے ادا کرتے، ان کی کوئی نماز قضا نہیں ہوتی تھی۔ سفر میں ہوں یا حضر میں گھر میں ہوں یا میدان جنگ میں وہ بلا ناغہ تلاوت کرتے اور تلاوت کے بعد بھی دیر تک مسنون ذکر واذکار کرتے۔ سلطان نے اپنے دورِ حکومت میں زراعت کو سائنسی بنیادوں پر ترقی دی۔ تجارت کو فروغ دیا فوجی ضروریات کے پیشِ نظر بہت سے کارخانے لگائے جہاں مختلف قسم کا اسلحہ تیار کیا جاتا۔ وہ قرآن کے اس فرمان کہ اپنے سامان کو دشمنوں کیلئے ہر وقت تیار رکھو۔ کو پوری طرح سمجھتے تھے۔

سلطان ٹیپو کو یہ انفرادیت بھی حاصل ہے کہ انہوں نے فضائل جہاد کے متعلق تمام احادیث کو کتابی شکل میں یکجا کر کے اس وقت کے مسلم حکمرانوں بشمول سلطان ترکی اور شاہ افغانستان کے نام یہ کتاب بھجوائی۔ جس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلم حکمرانوں کو جہاد کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا جائے۔ سلطان نے تحفۃ المجاہدین میں جو خطبہ لکھا، اس سے ان کے اعلیٰ ذوق اور جہاد سے محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ سلطان لکھتے ہیں۔

1۔ میں خدا کے کرم کے دروازے پر دل و جان سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اگر چہ مجھے اِس ام
کا بھی شکریہ ادا کرنے کا ہوش نہیں ہے لیکن اس کام میں میری وہی رہنمائی کرے گا۔

2۔ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والوں کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ میرا قلم اسے لکھنے سے قاصر ہے۔

3۔ اے خدا تو اپنے کرم سے تمام مسلمانوں کو یہ توفیق دے کہ وہ دین کیلئے کوشش کریں او
راہ ہدایت پر چلنے کی سعی کریں۔

4۔ اے مسلمان! تو راہ جہاد میں کوشش کرتا کہ تو دین اور دنیا میں خانہ آباد رہے اور خدا تج
سے راضی رہے۔

5۔ تو بروز جنگ اس بات کی کوشش کر کہ تیری تلوار سے یہودی کا خون بہے اور مجوسیوں
خاک اڑے۔

سلطان کے اسی جذبہ جہاد سے انگریز خائف تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ جب تک سلطن
خداداد میسور قائم ہے اور اس کا بیدار مغز حکمران زندہ ہے تب تک ہندوستان پر قبضے کا خوا
شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ وہ سلطان کو اپنے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔ برص
میں انگریزوں کو سب سے زیادہ لڑائیاں سلطان کے خلاف لڑنی پڑی تھیں۔ شیر میسور نے بے
دفعہ انگریزوں کو بے دست و پا کر کے رکھ دیا اور ان کی نیندیں حرام کر دیں۔ کوئی مشہور انگلیز جن
یا کمانڈر ایسا نہیں جو ٹیپو کے خلاف جنگ کیلئے نہ بھیجا گیا ہو۔ سلطان ٹیپو کے ساتھ نبرد آزمائی ک
بھیجے جانے والے انگریز جنرلوں اور کمانڈروں کی تعداد ایک محتاط اندازے کے مطابق 18
زائد ہے۔ لارڈ کارنوالس جو گورنر جنرل بھی تھا اسے بھی ٹیپو کے ساتھ مقابلے کیلئے میدان
اترنا پڑا۔ اسی طرح جنرل ولیم میڈوز جو برٹش آرمی کا مایہ ناز جنرل اور 25 سال تک فوجی خدما
انجام دے چکا تھا اسے بھی سلطان سے مقابلہ کیلئے بھیجا گیا۔ 1783ء میں جنرل میتھوز نے سلط
میسور کے علاقے بدنور پر قبضہ کر لیا جب سلطان کو اس حملہ کی خبر پہنچی تو وہ بجلی کی سی تیزی سے
دشمن کے سر پر جا پہنچے اور میتھوز کی سپاہ کو اس طرح محاصرے میں لیا کہ وہ نیاموں سے تلواریں نکا
بغیر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئی۔ میتھوز کو شکست دینے کے بعد سلطان بنگلور کی طرف بڑھے اور و
موجود برطانوی فوج کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اس شکست کے نتیجہ میں کمپنی کو سلطان سے صلح کا معاہدہ کرنا
اس معاہدہ کو ہندوستان میں برطانیہ کی شرمناک شکست سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

1791ء میں لارڈ کارنوالس نے میسور پر پہلی مرتبہ چڑھائی کی تو میجر ڈیرم کے بقول "
میدان جنگ انگریزی فوج کی لاشوں سے پٹ گیا۔ میلوں تک گھوڑوں اور سپاہیوں کی سر

لاشیں، خالی کارتوس اور تباہ شدہ توپیں نظر آ رہی تھیں''۔
اس کے بعد شکست پہ شکست انگریزوں کا مقدر بننے لگی، اِن کے قدم ڈگمگانے لگے اور ہوا اُکھڑ گئی اِنہیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ پوری برٹش آرمی اور اپنی دیسی فوج کا لاؤ لشکر اکٹھا کرنے کے باوجود سلطان کو شکست دینا ممکن نہیں ہے۔ تب انہوں نے عیاری و مکاری کی روایتی چالیں چلیں۔ اندر سے غداروں کو خریدا گیا اور باہر سے نظام حیدر، آباد مرہٹوں، اودھ کے حکمرانوں اور ہندوؤں کو ساتھ ملایا گیا۔
تمام تر تیاریوں کے بعد انگریزی فوج اپنے اتحادیوں کے ساتھ 1799ء میں میسور کی طرف بڑھیں۔ جنرل ہیرس کی قیادت میں انگریزی لشکر اور نظام کی فوج ایک مقررہ جگہ پر آن ملے۔ 11 فروری کو دیلور کی طرف سے آنے والے لشکر نے کوچ کیا اور 5 مارچ کو میسور کے علاقے میں داخل ہو گیا۔ دوسرا لشکر جنرل سٹیورات کی ماتحتی میں 21 فروری کو مغربی سمت سے وارد ہوا ٹیپو سلطان ہیرس کا راستہ روکنے کیلئے نکلے تو غداروں نے اپنی پہلی غداری دکھائی۔ انہوں نے سلطان کو اطلاعات بھجوائیں کہ فرنگی سپاہ کی تعداد بہت کم ہے۔ یوں سلطان اپنی فوج کو کھلے میدان میں لے آئے۔ مالاولی کے مقام پر ٹیپو کا سامنا ایک بہت بڑی فوج سے ہوا۔ قبل اس کے کہ وہ جنگی حکمت عملی کے تحت پیچھے ہٹتے اِن کے بہت سے قابل آدمی اور قیمتی توپیں ضائع ہو چکی تھیں۔ غدار اس حد تک حق نمک ادا کر رہے تھے کہ ان کے ذریعے انگریزوں کو سلطانی فوج کی ایک ایک اطلاع مل رہی تھی۔ یہاں تک کہ سرنگا پٹم کے قلعے میں دفاعی اِنتظامات کے متعلق بھی حملہ آوروں کو مکمل علم تھا۔ میر صادق، قمر الدین، میر قاسم، بدر الزمان، غلام علی لنگڑا، میسور کی رانی، سید صاحب اور پورینا یہ سب اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے مگر لالچ کی آگ میں کود کر سلطان ٹیپو سے غداری و بے وفائی کی جب غداروں اور اتحادی افواج کی مدد سے قلعہ کا محاصرہ ہو گیا تو انگریزوں نے سلطان کے سامنے صلح کی شرائط پیش کیں۔

☆ سلطان اپنے چار وزیر اور اپنے چار صاحبزادے ہمارے حوالے کر دے۔
☆ سیاست کا تمام ساحلی علاقہ ہمارے سپرد کر دے۔
☆ کرگ اور مالابار کی تمام بندرگاہیں ہمارے قبضہ میں دے دی جائیں۔
☆ تمام شرائط پر عملدرآمد صرف 24 گھنٹے کے اندر کیا جائے۔

جب سلطان ٹیپو کو یہ شرائط نامہ موصول ہوا تو انہوں نے اپنے جرنیلوں اور اعلیٰ عہدیداروں کو بحر اعلیٰ میں طلب کر کے مشورہ طلب کیا۔ سلطان کے سامنے قرآن تھا، آنکھوں میں آنسو تھے۔

جرنیلوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "کیا تمہیں یہ شرائط منظور ہیں؟" سب نے بیک زبان ہو کر کہ
"نہیں" اس کے بعد سلطان نے ذلت آمیز شرائط نامہ چاک کر دیا اور کہا" جا کر اپنے لارڈ سے کہ
کہ اللہ نے مجھے آزاد پیدا کیا ہے اور میں آزاد مملکت کا حکمران ہوں۔ میں آزادی اور اپنے دی
کی جنگ لڑوں گا لیکن یہ گھٹیا شرائط منظور نہیں کروں گا"۔

سلطان کا فیصلہ سنتے ہی جنرل ہیرس نے اپنی فوج کے توپخانے کو قلعہ پر گولے برسانے کا حک
دیا۔ دو تین دن مسلسل گولہ باری ہوتی رہی یہاں تک کہ قلعہ کی دیوار میں شگاف ہو گیا۔ دوسر
طرف عین اس وقت جب دیوار گر رہی تھی۔ میر صادق، قلعہ دار ندیم اور پورنیا نے وہاں پر متعین
فوج کو تنخواہ دینے کے بہانے ہٹا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی فوج بغیر مزاحمت کے قلعہ میں داخل ہ
گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے بارہ ہزار کے قریب بچے بوڑھے اور عورتیں تہہ تیغ کر دیئے۔ دوسر
طرف سلطان کی وفادار فوج بڑی بہادری سے لڑتی اور شہید ہوتی رہی۔ سلطان خود بھی طاؤس
نامی گھوڑے پر سوار بہادری دکھا رہے تھے۔ وہ جس طرف گھوڑا دوڑاتے دشمن کی فوج گیدڑ ک
طرح بھاگ اٹھتی۔

سلطان شجاعت و دلیری کی داستانیں رقم کرتے ہوئے قلعے کے اندرونی دروازے کی طرف
بڑھے۔ دروازے کے پاس ان کے گھوڑے کو گولی لگی تو وہ ڈھیر ہو گیا۔ تب سلطان نے پیادہ
جنگ شروع کر دی۔ قلعہ دار سردار ندیم قلعہ کی دیوار سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا وہ یہ بھی دیکھ رہا
کہ تین گولیاں لگنے سے سلطان زخمی ہو چکے ہیں ان کا بہت سا خون بہہ چکا ہے اور نقاہت ان
غالب آتی جا رہی ہے۔ سلطان نے بارہا دفعہ قلعہ دار کو دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ لیکن قلعہ دار اپ
ضمیر اور ایمان کا سودا کر چکا تھا لہٰذا وہ سلطان کا خون بہتے دیکھتا رہا مگر قلعے کا دروازہ نہ کھولا
جب نقاہت غالب آ گئی تو سلطان زمین پر گر پڑے اس وقت ان کے ایک جانثار راجہ خان ن
کہا" انگریز سے جان کی امان طلب کر لی جائے تو شائد بہتری کی کوئی صورت پیدا ہو جائے"۔

اس موقعہ پر سلطان نے نقاہت کے باوجود وہ تاریخی جملہ کہا کہ جو بعد میں آنے والی قومو
کیلئے ضرب المثل بن گیا، سلطان نے کہا" گیدڑ کی سوسالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زند
بہتر ہے"۔ اس حالت میں انگریزی فوج کے سپاہیوں نے سلطان کو گرتے ہوئے نیم بیہوشی
حالت میں دیکھا تو ان میں ایک نے سلطان کی بیلٹ تلوار اور تسبیح اُتارنے کی کوشش کی تو غیرت
سلطان نے سپاہی پر تلوار مار کر اسے زخمی کر دیا۔ دوسرا انگریز سپاہی جو کہ ساتھ ہی کھڑا تھا اس
سلطان کی کنپٹی پر بندوق رکھ کر گولی چلا دی۔ یوں میسور کا یہ آفتاب ہمیشہ کیلئے غروب ہو گیا۔

سلطان کی شہادت کے ساتھ ہی قلعہ میں بھگدڑ مچ گئی، غداروں کا سرغنہ میر صادق بھگدڑ سے بچنے اور انگریزی فوج کی پناہ لینے کیلئے قلعہ سے نکلا تو سلطان کے ایک وفادار سپاہی احمد خان کے ہاتھ چڑھ گیا احمد خان نے فوراً ہی تلوار سے اس کے ناپاک جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔

غداری کرنے والے اگرچہ چند ہی افراد تھے لیکن انتظامی عہدوں پر فائز ہونے کی وجہ سے ان کی غداری کے نتیجہ میں سلطان اور اس کی فوج کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ تاہم سلطان کے وفادار فوجی آخری دم تک پوری جرات کے ساتھ لڑتے رہے اور بارہ سے چودہ ہزار کے قریب شہید و زخمی ہوئے۔ سلطان نے خود بھی جرات و بہادری کے بے مثال نمونے پیش کئے، کئی انگریز افسر مار گرائے جب نوبت دست بدست لڑائی تک پہنچی تو شمشیر زنی کے جوہر دکھائے اور شدید زخمی حالت میں بھی بہت سے دشمنوں کو قتل و زخمی کیا۔

تلوار کے ساتھ سلطان کی محبت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جب شام کے وقت سلطان کی لاش شناخت ہوئی تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ سلطان کا ایک ہاتھ تلوار کے قبضہ پر اسی طرح جما ہوا تھا۔ چہرے کے تحکمانہ آثار، کھلی آنکھیں اور گرم جسم نے انگریزوں کو ایک لمحے کیلئے حواس باختہ کر دیا کہ سلطان ابھی زندہ ہیں لیکن ایک انگریز سرجن نے بتایا کہ سلطان کے جسم میں زندگی کی کوئی رمق نہیں رہی۔ تاہم کرنل ولزلی کو اب بھی شبہ تھا کہ شیر میسور زندہ ہے، اس نے دل پر کان رکھا اور نبض پر انگلیاں رکھیں، تب اس کا شک یقین میں تبدیل ہوا کہ سلطان جہان فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔

4 مئی 1799ء کو سرنگاپٹم میں سلطان ٹیپو کی شہادت حقیقت میں پورے برصغیر کے مسلمانوں کی شکست تھی۔ اگر اس موقع پر سلطان کی جیت ہوتی تو یقیناً یہ جیت پورے برصغیر کے مسلمانوں کی ہوتی۔ سلطان کی شہادت سے تسخیر دہلی کی راہ ہموار ہوگئی۔ آرکاٹ، اودھ، نظام، مرہٹے اور تنجور اپنی اپنی آزادی کھو بیٹھے۔

سلطان کی شہادت پر انگریزوں نے جشن مسرت منایا، گرجوں میں شکرانے کی عبادت کی، گورنر جنرل اور کمپنی کے ہر ملازم کو جس نے اس کاروائی میں حصہ لیا تھا پورا معاوضہ دیا گیا۔ افسران کو مزید ترقیاں دی گئیں۔ ولزلی کو مارکوئس آف ولزلی کا خطاب دیکر آئرلینڈ کی گورنری دی گئی اور جنرل ہیرس کو لارڈ بنا دیا گیا۔

سلطان کی جرات و بہادری اور انگریزوں سے نفرت کی داستانیں نسل در نسل مسلمانوں میں

منتقل ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ وقت آ گیا جب مسلمانوں کی غالب اکثریت انگریز کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئی۔ ڈاؤن ڈاؤن یونین جیک کے نعروں سے برصغیر کے در و دیوار لرز اٹھے۔ آخر سلطان ٹیپو کی شہادت اور قیمتی خون رنگ لا کر رہا اور انگریزوں کو نہ چاہتے ہوئے بھی برصغیر چھوڑنا پڑا۔ پھر چشم فلک نے دیکھا کہ شکست جنرل ہیرس، کارنوالس اور ولزلی کے شوگردوں کا مقدر بنی اور جیت حیدر علی اور سلطان ٹیپو کے روحانی فرزندوں کا نصیبہ۔

آج پاکستان سمیت پورا عالم اسلام ایک دفعہ پھر اسی قسم کے حالات سے دوچار ہو چکا ہے۔ مسلم ممالک امریکہ کی کالونیاں بن چکی ہیں اور مسلم حکمران برصغیر کے میر صادق کا کردار ادا کر رہے ہیں پاکستان کو اسلام کا قلعہ اِس لئے کہا جاتا ہے کہ اِس کے قیام اور اس کی بنیادوں میں سلطان ٹیپو کے روحانی فرزندوں کا خون شامل ہے۔ آج پاکستانیوں سمیت پوری ملت اسلامیہ پاکستانی حکمرانوں سے میر صادق کی بجائے سلطان ٹیپو کے کردار کی توقع رکھتی ہے۔ جو شرائط انگریزوں نے سلطان سے منوانی چاہیں وہی شرائط امریکہ ہمارے حکمرانوں سے منوا رہا ہے ملازمین پاکستان جو درحقیقت سلطنت خداداد میسور ہی کا تسلسل ہے اِس کے دفاعی اہمیت کے حامل خطے امریکیوں کو دیئے جا رہے ہیں جس طرح انگریزوں نے سلطان کے فرزندوں اور چار نہایت ہی قابل جرنیلوں کو سلطان سے بطور یرغمال طلب کرنا چاہا بعینہ آج بھی امریکہ ہمارے حکمرانوں سے مجاہدین اسلام کو طلب کر رہا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ 1799ء کا دور پھر لوٹ آیا ہے۔ سب کچھ وہی ہے، وہی میسور، وہی سرنگاپٹم، وہی کارنوالس، وہی میر جعفر و میر صادق ہیں۔ تمام کردار اسی طرح اپنی اپنی جگہ پر موجود ہیں ہاں۔۔۔۔ اگر کمی ہے تو صرف سلطان ٹیپو کی۔

بانی سلسلہ کی دیگر تصانیف

تعمیر ملت

قرون اولیٰ میں مسلمانوں کی بے مثال ترقی اور موجودہ دور میں زوال وانحطاط کی وجوہات
اسلامی تصوف کیا ہے؟ سلوک طے کرنے کا عملی طریقہ، سلوک کا ماحصل اور سلوک کے ادوار
ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ عالم روحانی کی تشریح، جنت، دوزخ کا محل وقوع
اوران کے طبقات کی تعداد، انسانی روح کی حقیقت کیا ہے؟ روح کا دنیا میں آنا اور
واپسی کا سفر، اسلامی عبادات، معاملات، اوراخلاق وآداب کے اسرار ورموز اور نفسیاتی
اثرات، امت مسلمہ کے لئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حصول کیلئے واضح لائحہ عمل۔

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

چراغ راہ

کتاب ہذا بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطبات پر مشتمل ہے۔ جو آپ نے سالانہ
اجتماعات پر ارشاد فرمائے اسمیں درج ذیل خصوصی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔
سلوک وتصوف میں ذاتی تجربات، مرشد کی تلاش کے دس سالہ دور کا حال۔
زوال امت میں امراء، علماء، صوفیا کا کردار۔ علماء اور صوفیاء کے طریق اصلاح کا فرق
تصوف خفتہ اور بیدار کے اثرات اور تص[illegible] کے انسانی زندگی پر اثرات۔
سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیر[illegible]راہ کیونکر آسان ہوئی۔

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

طریقت توحیدیہ

یہ کتاب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا آئین ہے۔ اس میں سلسلے کی تنظیم اور عملی سلوک کے طر
تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جولوگ سلسلہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں انہیں
کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تصوف کی تاریخ میں
مرتبہ فقیری کا مکمل نصاب اس چھوٹی سی کتاب میں قلم بند کردیا ہے۔ اس میں وہ
اوراد و اذکار اور اعمال واشغال تفصیل کے ساتھ تحریر کردیئے ہیں جس پر عمل کر
کے ایک سالک اللہ تعالیٰ کی محبت، حضوری، لقاء اور معرفت حاصل کرسکتا ہے۔

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

حقیقت وحدت الوجود

کتاب ہذا وحدت الوجود کے موضوع پر ایک مختصر مگر نہایت مدلل اور اہم دستاویز ہے
خواجہؒ صاحب نے ذاتی مشاہدہ کو عام فہم دلائل کی روشنی میں آسان زبان میں بیان
ابن عربیؒ کے نظریہ وحدت الوجود اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے وحدت شہود میں فرق
انسان کی بقا اور ترقی کیلئے مذہب کیوں ناگزیر ہے۔
وہ بنیادی سوال جس نے نظریہ وحدت الوجود کو جنم دیا۔
روحانی سلوک کے دوران تمام بزرگان عظام کو ہوجانے والی غلط فہمیاں۔

سلسلہ عالیہ توحیدیہ